پھلواری

حسین سحر

پُھلکاری

منتخب پنجابی اور سرائیکی ادب کے اُردو تراجم

حسین سحر

سحر سنز..................ملتان/لاہور

ضابطہ

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اوّل..............................2008ء

اہتمام..............................الکتاب گرافکس پل شوالہ ملتان

طابع..............................عاتکہ پرنٹرز۔ملتان

ناشر..............................سحر سنز۔ لاہور/ملتان

قیمت:..............................200روپے

ملنے کا پتا

کتاب نگر۔حسن آرکیڈ ملتان چھاؤنی

انتساب

قومی یکجہتی

کے نام

ترتیب

پنجابی شاعری

۱۔ بابا فریدؒ 15

۲۔ شاہ حسینؒ 16

۳۔ بُلھے شاہؒ 17

۴۔ وارث شاہؒ 18

۵۔ سلطان باہوؒ 19

۶۔ محمد بخشؒ 20

۷۔ مولوی غلام رسول عالم پوریؒ 21

۸۔ حامد شاہ عباسی 22

۹۔ ہاشم شاہ 23

۱۰۔ بردا پشاوری 23

۱۱۔ احمد علی سائیں 24

۱۲۔ ہدایت اللہ 24

۱۳۔ محمد بوٹا 25

۱۴۔ ملکھی رام 25

۱۵۔ موہن سنگھ 26

۱۶۔ امرتا پریتم 28

۱۷۔ عاشق زار 30

۱۸۔ میاں برکت علی 30

۱۹۔ پیر فضل گجراتی 31

۲۰۔	چاچا چگ	31
۲۱۔	صوفی تبسم	32
۲۲۔	شریف کنجاہی	33
۲۳۔	عارف عبدالمتین	34
۲۴۔	عرش صدیقی	34
۲۵۔	منیر نیازی	35
۲۶۔	اقبال صلاح الدین	37
۲۷۔	حامد کرنا ریوری	38
۲۸۔	علی محمد ملوک	39
۲۹۔	ولی محمد واجد	40
۳۰۔	صحرائی گورداسپوری	41
۳۱۔	شبنم شکیل	42
۳۲۔	ع۔س۔مسلم	43
۳۳۔	فخر زمان	45
۳۴۔	افضل احسن رندھاوا	45
۳۵۔	شفیع عقیل	47
۳۶۔	بشیر حسین ناظم	48
۳۷۔	امین خیال	49
۳۸۔	طارق عزیز	49
۳۹۔	مقبول احمد	50
۴۰۔	انعام الحق جاوید	52
۴۱۔	شوکت علی قمر	53

۴۲۔	شہزاد قیصر	55
۴۳۔	اعزاز احمد آذر	56
۴۴۔	اندر جیت	57
۴۵۔	عمر غنی	58
۴۶۔	کلیم شہزاد	59
۴۷۔	حنیف صوفی	60
۴۸۔	سعد اللہ شاہ	60
۴۹۔	ریاض احمد شاد	61
۵۰۔	نور زمان ناوک	62
۵۱۔	ساقی گجراتی	64
۵۲۔	نثار ترابی	65
۵۳۔	نذیر اظہر	66
۵۴۔	نوید شہزاد	67
۵۵۔	خان محمد ساجد	69
۵۶۔	شفیق آصف	70

سرائیکی شاعری

۱۔	غلام حسن شہیدؒ	73
۲۔	علی حیدرؒ	74
۳۔	سچل سرمستؒ	75
۴۔	خوشدلؒ	76
۵۔	لطف علیؒ	76
۶۔	خواجہ غلام فریدؒ	77

۷۔	چراغ اعوان	83
۸۔	خیر شاہ	83
۹۔	جانباز جتوئی	84
۱۰۔	حسن رضا گردیزی	85
۱۱۔	ارشد ملتانی	88
۱۲۔	نقوی احمد پوری	90
۱۳۔	حیدر گردیزی	91
۱۴۔	دلدار بلوچ	94
۱۵۔	محسن نقوی	95
۱۶۔	ممتاز حیدر ڈاہر	96
۱۷۔	اقبال سوکڑی	98
۱۸۔	سرور کربلائی	99
۱۹۔	رشید عثمانی	99
۲۰۔	احمد خان طارق	100
۲۱۔	نصر اللہ خان ناصر	101
۲۲۔	طاہر تونسوی	102
۲۳۔	شاکر شجاع آبادی	103
۲۴۔	اکبر ہاشمی	105
۲۵۔	خالد اقبال	107
۲۶۔	فیض بلوچ	108
۲۷۔	قیس فریدی	109
۲۸۔	شکیل پتافی	110

پنجابی افسانے

۱۔	اکبر لاہوری	113
۲۔	آغا اشرف	124
۳۔	رفعت	127
۴۔	حنیف چودھری	132
۵۔	اقبال خالد	138
۶۔	نیلما ناہید درانی	144

سرائیکی افسانے

۱۔	غلام حسن حیدرانی	149
۲۔	دلشاد کلانچوی	153
۳۔	بشریٰ رحمٰن	157
۴۔	حامد فہیم	163
۵۔	سجاد حیدر پرویز	167
۶۔	انوار احمد	171
۷۔	طارق جامی	176
۸۔	حفیظ خان	180
۹۔	قاسم سیال	187
۱۰۔	پروین عزیز	191

پیش لفظ

ترجمہ روزِ اول ہی سے میرا مرغوب مشغلہ رہا ہے۔ شاعری اور نثر کی دیگر طبع زاد اصناف سے دلچسپی اپنی جگہ مگر ترجمہ میری پہلی محبت ہے۔ اسکول اور کالج کے زمانہ طالب علمی میں اس شوق کا آغاز ہوا جو اب تک جاری ہے۔ جونہی موقع ملتا ہے ترجمہ مجھے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس میں زبان کی بھی کوئی قید نہیں۔ میں نے انگریزی، عربی، فارسی، پنجابی اور سرائیکی سب میں طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں خالد الفیصل کی عربی نظموں اور قرآن پاک کا اردو میں منظوم ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پنجابی اور سرائیکی کے تراجم ہیں جو گاہے گاہے ہوتے رہے ہیں۔

ترجمہ بذاتِ خود ایک مشکل فن ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں جذبات و احساسات کی منتقلی کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ادب میں ترجمے کی اہمیت مسلمہ ہے کہ اسی کے ذریعے ادب کا افق وسیع سے وسیع تر ہوتا ہے اور ہم دوسروں کے خیالات سے آشنا ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں پنجابی اور سرائیکی ادب کے ان شعری اور نثری تراجم کا ایک انتخاب شامل ہے۔ جو میں نے گزشتہ پچاس برس کے عرصے میں مکمل کئے ہیں اور ان میں سے اکثر مختلف ادبی رسائل و جرائد خاص طور پر اکادمی ادبیات کے مجلّے ''ادبیات'' اسلام آباد میں شائع ہو کر اہلِ فن سے پذیرائی بھی حاصل کر چکے ہیں۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ شاعری اور افسانوی ادب۔ شاعری میں صوفی شعرا کے ساتھ ساتھ مرحوم کلاسیکی شعرا کے علاوہ جدید شعرا بھی شامل ہیں۔ جن کی تعداد ۸۴ ہے اسی طرح

افسانوی ادب میں کل سولہ منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تراجم شریک ہیں۔ یوں مجموعی طور پر اس کتاب میں ایک سو لکھاریوں کی تحریریں شامل ہیں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ ان تراجم میں کم سے کم لفظوں میں اس روح کو اردو زبان میں منتقل کر دوں۔ جو ان کی اصل میں موجزن ہے۔ شاعری کے تراجم میں زیادہ تر وہی بحر استعمال کی گئی ہے جس میں اصل متن ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں۔ اس کا فیصلہ بہتر طور پر قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ ان تراجم کیلئے متن کا انتخاب میں نے مختلف جرائد و کتب سے کیا ہے اور میں انہیں متعلقہ جرائد اور صاحب کتاب اہل قلم کے شکریئے کے ساتھ شامل کر رہا ہوں۔

کتاب کا نام ''پھلکاری'' اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ اس میں نظم اور نثر کے مختلف پھولوں کا رنگ ہے۔ ''پھلکاری'' پنجاب میں اس چادر کو کہا جاتا ہے جس پر رنگا رنگ پھول کڑھے ہوتے ہیں اور عام طور پر عورتیں اسے اوڑھتی ہیں۔ نظم و نثر کی اس ادبی ''پھلکاری'' میں بھی مختلف پھول اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔ کہیں تصوف کا رنگ ہے تو کہیں رومان کی خوشبو، کہیں غزل کی رم جھم ہے تو کہیں افسانے کی دھنک۔ امید ہے قارئین زندگی کے اس رنگ روپ کو پسند فرمائیں گے۔

ان ترجموں کی اشاعت کا مقصد اردو داں طبقے کی پنجابی اور سرائیکی ادب کے مزاج تک رسائی ہے۔ تاکہ وہ پاکستانی ادب کے اس اہم رنگ کو جان سکیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پنجابی اور سرائیکی کے علاوہ دیگر پاکستانی زبانوں مثلاً سندھی، بلوچی، براہوی، پشتو، پوٹھوہاری، ہندکو، کشمیری اور گوجری وغیرہ سے بھی زیادہ سے زیادہ ترجمے اردو میں کئے جائیں تاکہ باہمی مفاہمت کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی اور یگانگت کو فروغ دیا جا سکے۔

حسین سحر

A/۲۶۵ چاہ بوہڑ والا ملتان

۱۰ اکتوبر ۲۰۰۸ء

پنجابی شاعری

ابیات

خاک سا نہیں فرید کوئی بھی بُرا نہ اسے کہو
زندہ ہوں تو پاؤں کے نیچے مریں تو اوپر ہو

روکھی سوکھی کھا فریدا ٹھنڈا پانی پی
کسی کی چپڑی دیکھ کے یونہی کیوں ترسائے جی

کالے میرے کپڑے ہیں اور کالا میرا بھیس
میں ہوں فرید گناہ سے پُر اور لوگ کہیں درویش

کافی

ان کو کیسا رنج سکھی ری جن کے ساتھ وہ ذات
پیاری صورت دلبر والی رہ گئی آنکھ میں بات
اک لحہ بھی جدا نہ ہو وہ جنم جنم کا سات
کہے حسین فقیر کا چلنا اِس دن یا اُس رات

اے نادان اے پگلی تیری عمر گزرتی جائے
یہ دنیا ہے چار دنوں کی کوئی انت نہ پائے
دولت دنیا مال خزینے سب ہیں ڈھلتے سائے
کہے حسین فقیر کہ باقی نام خدا رہ جائے

میرے حال کا محرم ہے گر کوئی تو رب تو
اندر بھی تو باہر بھی تو میرا ہے سب تو
تو ہے تانا تو ہے بانا میرا ہے اب تو
کہے حسین فقیر سائیں کا میں ناہیں سب تو

کافی

میں تیرے قربان۔ آنگن آ جا مرے

تجھ جیسا کیا اور ہے کوئی؟
ڈھونڈوں جنگل بیلا روہی
ڈھونڈو میں سارا جہان
آنگن آ جا میرے

لوکوں میں کہلائے رانجھا
ان کے خیال میں ہے چرواہا
میرا ہے دین ایمان
آنگن آجامیرے

شاہ عنایت مرشد میرے
بندھی ہوں میں دامن سے تیرے
لگی کی لاج کو جان
آنگن آ جا میرے

ہیر

یہ دنیا جگہ فنا کی ہے سب ریت کی ہے دیوار جینا
سایہ بادلوں کا عمر آدمی کی عزرائیل نے پھاڑنا اور سینا
یہ میلہ جہان کا ہے دو دن یہاں نت کسی نے نہیں جینا
وارث شاہ ہے آخر خاک ہونا چاہے آبِ حیات بھی ہو پینا

کہا جوگی نے پیچھے نہ پڑو میرے شیر سانپ فقیر کا دیس کیسا؟
بن کے کونج عمولوں نے دیس چھوڑا کوئی ذات صفات اور بھیس کیسا؟
وطن ساتھ ہمارے ہے ذات جوگی ہے اپنا قبیلہ اور خویش کیسا؟
جو وطن اور ذات کا دھیان رکھے دنیا دار ہے وہ درویش کیسا؟

ابیات

جو دم غافل سو دم کافر مرشد یہی پڑھایا ہو
سنا سخن تو کھل گئیں آنکھیں رب سے دھیان لگایا ہو
کی ہے جان حوالے رب کے ہم نے وہ عشق کمایا ہو
موت سے پہلے مر گئے باہو تب مطلب کو پایا ہو

دل دریا گہرے ساگر سے کون دلوں کی جانے ہو
اسی میں بیڑے اسی میں طوفاں اسی میں لہرتا نے ہو
چودہ طبق ہیں دل کے اندر خیمے جیسے تانے ہو
وہی ہے محرم دل کا باہو۔ رب کو جو پہچانے ہو

چڑھ اے چاند اجالا کر تو، ذکر ہیں کرتے تارے ہو
گلیوں میں پھرتے ہیں بچارے لعلوں کے بنجارے ہو
کوئی مسافر ہو نہ خدایا جن کے نہیں سہارے ہو
ہم کو اڑا نہیں باہو ہم تو خود ہیں درد کے مارے ہو

مرشد مثل سنار ہے ڈال کٹھالی میں جو گالے ہو
گھڑے نکال کٹھال سے پھر وہ بندے ہوں یا بالے ہو
کان سجیں محبوب کے وہ جب کھٹا ڈال اجالے ہو
نام فقیر انہی کا باہو جنہوں نے یار سنبھالے ہو

سیف الملوک

نیچوں کی یاری سے کسی نے فیض نہیں کچھ پایا
کیکر پر انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

دشمن مرے تو خوشی نہ کیجے یاروں نے بھی مرنا
شام ہوئی دن گیا محمد سوکھے گا یہ جھرنا

ایک بنائیں شیشے کو اک توڑیں پتھر بن کے
کم ہی دنیا میں ہوتے ہیں قدرشناس سخن کے

حسن کی لاکھ بہار ہو اک دن مٹی میں ہے سمانی
لگا پریت محمد ایسی جگ میں رہے کہانی

عشق

عشق بنا تن دشمن دل کا اور دل دشمن تن کا
بیری سنگ ہوا ہے بیری جیسے خار چمن کا
عشق بنا دل مردہ غافل کس گنتی میں آئے
عشق دلوں کو صقل غموں سے کر شمشیر دکھائے
عشق کرم کا قطرہ ازلی سب کے نہیں حصے میں
ایک کو ڈھونڈے ہاتھ نہ آئے ایک کے ہے رستے میں

❁ ❁ ❁

مرثیہ

کربل کے یوں دشت میں قاسم کا تھا بیاہ
باراتی نوشہ کے تھے دلسوزی اور آہ
درد ، الم ، دلگیریاں بے صبری ، آزار
بے آرامی ، بے بسی ، آئی زارو زار
ظلم تھا اور خوں ریزیاں نعرے ہیبت ناک
بے ترسی بے رحمیاں اور فضا غمناک
نا گانا تھا ہاتھ میں نا تھا رنگ حنا
دل کی دل میں رہ گئی رب کی یہی رضا

ساتھی میرے کٹ گئے اور بھائی عباس
قاسم اکبر گزر گئے میں بھی کھڑا اداس
اصغر نے بھی موت کا پی لیا میٹھا شیر
مارا اس کے حلق میں کھینچ شمر نے تیر
لکھا مجھ سے جائے نا اپنا حال تباہ
جگر قلم کا پھٹ گیا' کاغذ مارے آہ

ہاشم شاہ

بیت

ایک ہی طور بہار نہ ہرگز ایک ہی طور زمانہ
ہر دم چال نہیں البیلی زور نہیں روزانہ
گریہ سوگ ہمیش نہ ہونہیں نت نت راگ شہانہ
ہاشم روز مسافر آئیں جگ ہے مسافر خانہ

سسی

نازک پیر ملوک سسی کے مہندی سے تھے سنگارے
ریت تپے تھل اندر جیسے جو بھونیں بھٹیارے
سورج بادل میں جا دبکا ڈرتا پر نہیں مارے
ہاشم دیکھ یقیں سسی کا صدق سے کب وہ ہارے؟

بردا پشاوری

بیت

بردا یارو یہ مرض ہے عشق والا دارو لگتے نہیں طبیب والے
ساہوکاروں کے سخن منظور ہیں سب نہیں سخن منظور غریب والے
کام لیتے ہیں وہ ساتھ عاجزی کے رس چوستے ہیں میٹھی جیبھ والے
بردا کئی درختوں کی کرے راکھی میوہ پکے تو کھائیں نصیب والے

احمد علی سائیں

بیت

خ۔خال دمکتا ہے ماتھے پر جیسے مشتری زہرہ جبیں پر ہو
ہو کعبے میں چور اسلام کا یا ہندو کوئی آ گیا دیں پر ہو
یا پرِ طاؤس نشانی کو قاری نے رکھا یٰسیں پر ہو
یا موذنِ مسجدِ بلال سائیاں نقطہ خال کا ماہ جبیں پر ہو

ہدایت اللہ

سی حرفی

الف آنکھیں کھول کے دیکھ مورکھ جسے ڈھونڈے ہے تجھ سے وہ دور نہیں
شاہ رگ سے بہت نزدیک ہے وہ تیرا اپنا قلب حضور نہیں
اندھا خود ہے تو چمگادڑ سا آفتاب کا کچھ بھی قصور نہیں
پڑا پردۂ غفلت ہدایت اللہ دکھتا تبھی تو تجھ کو نور نہیں

محمد بوٹا گجراتی

سی حرفی

ت۔تکا جو یار کی زلف اندر تھا چمکتا نور کوہ طور والا
بھولے ہوش اور عشق کا جوش آیا کیا نوش پیالہ منصور والا
دے سکھ اور جھولی میں دکھ ڈالے کیا سودا یہ بہت قصور والا
روتے عمر گزاری محمد بوٹا کھائے ترس نہ یار غرور والا

ملکھی رام

سسی

ہوا دوسرا یہ آفتاب پیدا یا زمیں پہ اتر مہتاب آیا
کبھی گیسو بکھیرے جو مکھڑے پر ہری شاخ پہ نکل گلاب آیا
آ گے دانتوں کے آب کیا موتیوں کی ڈرھدن گئی ہو کے بے آب آیا
ماتھا چودھویں رات کا چاند چمکے آفتاب کا گویا جواب آیا
گردن سسی کی صاف بلور کی تھی پری شیشے میں اتری یا آب آیا

موہن سنگھ

نظم

اک دن میں پھلواری میں سے
گزر رہا تھا تنہا
ایک گلابی پھول کے کانٹے نے
مرا دامن پکڑا
"اتنی جلدی کرو نہ راہی!
پل دو پل تو ٹھہرو!
خوشبو بن تم کو ہم راہی
جانے نہ دیں گے تنہا

دل

لکڑی ٹوٹے تو کڑ کڑ ہو
شیشہ ٹوٹے تڑ تڑ
لوہا ٹوٹے تو کڑ کڑ ہو
پتھر ٹوٹے کھڑ کھڑ
صد تحسین عاشق کے دل کو
اللہ رکھے سلامت
یہ جب ٹوٹے
صدا نہ نکلے
نہ کڑ کڑ نہ کڑ کڑ

جنگلی پھول

جون بشر کی اچھی ہوگی
لیکن میں پچھتایا
اچھا ہوتا اگر مجھے رب
جنگلی پھول بناتا
دور دراز کسی گوشے میں
خاموشی سے اُگتا، پھلتا
کھلتا اور مر جاتا

❁ ❁ ❁

پنکھیرو

ہوا کے پنکھیرو
مری سمت آج اپنے آرام دہ پنکھ موڑ
اب مری زندگی کے شجر پر نئے سبز پتے ہیں رقصاں
مرا آشیانہ ہے آباد
باغوں کی رنگین رُت کے اثر سے
مگر یہ نئے سبز پتے بھی
پت جھڑ میں جھڑ جائیں گے
یہ شجر یہ مرا آشیانہ بھی ویران ہو جائے گا
اور مری عمر کی شاخ کی نرم و نازک کلائی
اچانک فضا میں اچھل کر جھلس جائے گی
اے ہوا کے پنکھیرو
میری سمت آج اپنے آرام دہ پنکھ موڑ

دو آنسو

دو آنسو بہنے لگے
دو آنسو تیری آنکھوں میں
دو آنسو میری آنکھوں میں
وہ صبح گئی
وہ شام گئی
اب دیپ بھی جلنے لگے
دو آنسو بہنے لگے
ان آنسوؤں کی ہے قسم تم کو
تم یاد کرو میں یاد کروں
انگارے سلگنے لگے
دو آنسو بہنے لگے
لاکھ آنسو تم نے بھی رو کے
لاکھ آنسو میں نے بھی رو کے
میرے اور تمہارے گالوں پر
اب صاف جھلکنے لگے
دو آنسو بہنے لگے

عاشق زار

سی حرفی

ح۔حسن محبوب کا چمکے ہے جیسے بجلی ہے بار بار چمکے
نیچے بھووں کے یوں دو نین چمکیں جیسے بیچ میدان تلوار چمکے
لٹک رہی ہے گلے میں زلف کالی جیسے گلے میں اک چمن ہار چمکے
عاشق زار ہوں چودہ طبق روشن حسن یار کا گر اک بار چمکے

میاں برکت علی

چٹھی

قلم مرے! مل رخ پہ سیاہی ماتھا خوب گھسا کر
لاکھ سلام لکھوں میں پہلے ادب سے سیس جھکا کر
دل معمور ہے درد سے میرا عرض گزارے تجھ کو
بہت احسان ترا میں جانوں یار ملا دے مجھ کو
قلم کہے جو حکم خدا ہے ٹالے کب ٹلتا ہے؟
سب کو خوشیاں بھی وہ دے گا جو جگ کا داتا ہے

پیر فضل گجراتی

غزل

بے رخی سے تری میخانے میں ہے سبھی دلوں میں اک اضطراب ساقی!
جرعہ جرعہ بھی ہو نہیں ہرج کوئی مے ملے جو ہم کو شتاب ساقی!
ہے عید کے چاند کی آس ہمیں تا شام ذرا زیر نقاب رہنا
کہیں دن میں ہی کھول نہ دیں روزہ ترا دیکھ کے مکھ مہتاب ساقی!
کہیں اس کے پروں کے سہارے ہی سیر عرش کی رند ہیں کرآتے
وہ جو شیشے کے پنجرے میں تو نے یہاں کر کے رکھا ہے قید سرخاب ساقی!
کیا ہوا جو مست ہیں نین ترے آنکھیں میری بھی رہتی ہیں مست مست
مرے پاس بھی تو سرخ آنسو ہیں یہ گر تیری ہے سرخ شراب ساقی!
مشتاق ہوں فضل شراب کا میں کوئی قیمتی جام درکار نہیں
پیالہ مٹی کا بھی ہے قبول مجھے مرا پیر ہے ابوتراب ساقی!

چاچا جگ

توبہ

تیری رحمتوں کے دیکھ آسرے کو گیا بھول میں روپ انسان اندر
خوب کئے گناہ نہ غور کیا رہا مست میں اپنی ہی شان اندر
کیا کام نہ کوئی بھی نیک میں نے کھاتا ٹھوکریں رہا جہان اندر
کروں اپنے آپ بیان کیسے طاقت رہی نہ میری زبان اندر
پشیمان ہو کے آنسو بہتے ہیں دل کرتا ہے سو سو بار توبہ
توبہ توبہ مری استغفار توبہ

صوفی تبسم

غزل

من کے اندر ڈھک کر رکھنا پیار نگر کی باتیں
ہر اک سے نہیں کرتے پھرتے اپنے گھر کی باتیں

آنسو آنکھوں میں ہیں بے شک سینے میں فریادیں
کیسے روک سکے گا لیکن کوئی نظر کی باتیں

رہتے ہیں چپ چاپ بظاہر لب نہ ہلائیں ہرگز
آنکھوں سے کہہ دیتے ہیں ہم دنیا بھر کی باتیں

وہ نظریں کیا جانیں صوفی راز ہمارے دل کا
سمجھ نہ پائیں جو نظریں اب تک باہر کی باتیں

شریف کنجاہی

بے خوابیاں

آنکھوں میں سے نیند آج کس نے اڑائی ہے؟
پلکوں نے جڑنے کی جیسے قسم کھائی ہے
کب کے ستارے اپنی آنکھیں جھپکاتے ہیں
ایک اک کرکے وہ سبھی سوتے جاتے ہیں
ساتھ والے کوٹھوں پہ بھی لوگ سوئے ہوئے ہیں
زندگی کے رنگوں میں وہ جیسے کھوئے ہوئے ہیں
لیتے ہیں خراٹے بے فکرے یہ کیسے ہیں!
اور ہم کروٹوں پہ کروٹیں ہی لیتے ہیں
زندگی کی رات بھی کچھ ایسے بیت گئی ہے
پتا نہیں کیسی ہے وہ باقی جو بھی بچی ہے
بیتی ہوئی عمر میں بے خوابیاں ہی یاد ہیں
آنکھوں کے نگر میں رتجگے ہی بس آباد ہیں
نیند کہاں؟ نیند کی کہاں ہیں پرچھائیاں
اپنے نصیب میں تو رہ گئیں جمائیاں

عارف عبدالمتین

تنہائی کا سفر

میرا ہردا
پھوڑے جیسا دکھتا ہے
میرا اندر
دھیمی دھیمی آگ کے کارن جلتا ہے
میں نروان کا کھوجی ہوں
جنگل جنگل بیلے بیلے
مکتی ڈھونڈتا پھرتا ہوں

عرش صدیقی

دیوانہ

راہوں میں یوں عمر بتا کے
سارا حسن شباب گنوا کے
کانپتا ڈرتا دل کا ستایا
اک راہی بستی میں آیا
پورب سے لے کر پچھم تک
لوگ کہیں اس کو دیوانہ

منیر نیازی

غزل

ہے شکل تیری گلاب جیسی — نظر ہے تیری شراب جیسی
صدا ہے اک دوریوں کے پیچھے — مری صدا کے جواب جیسی
وہ دن تھا دوزخ کی آگ جیسا — وہ رات گہرے عذاب جیسی
یہ شہر لگتا ہے دشت جیسا — چمک ہے اس کی سراب جیسی
یہ آج کی صبح کیا ہوا ہے؟ — بدلتے موسم کے خواب جیسی
منیر تیری غزل عجب ہے — کسی سفر کی کتاب جیسی

غزل

بادل اڑے تو گم آسان دیکھا — پانی اترے تو اپنا مکان دیکھا
اس سے آگے فراق کی منزلیں تھیں — جہاں پہنچ کے اس کا نشان دیکھا
اس کے سامنے دنیا ویران لگی — اس کی آنکھوں میں ایسا جہان دیکھا
خبر اس کو ہمارے احوال کی تھی — ساری عمر جسے انجان دیکھا
کام وہی منیر تھا مشکلوں کا — جو شروع میں تھا آسان دیکھا

فراق کی رات

لمبی رات فراق کی
جیسے ٹھنڈی سل
چڑھا جو چاند آکاش پہ
تھر تھر کانپے دل

شہر کے مکان

اپنے ہی ڈر سے
جڑے ہوئے ہیں
اک دوجے کے ساتھ

ایک لڑکی

پیار وہ کرنے سے پہلے
کتنی پیاری لگتی تھی
اپنے مرنے سے پہلے
کتنی پیاری لگتی تھی

اقبال صلاح الدین

لیکھ

جب تک
سورج
رہے گا چڑھتا ڈوبتا یونہی
تب تک یونہی
کالی اور سیہ راتیں بھی
آتی رہیں گی آگے پیچھے

مشکل گھائی

شام ہوئی تو پنچھی سارے
ڈاریں بن بن اڑتے جائیں
چھوڑ کے آدم کی بستی کو جنگل بیلے رات گزاریں
جہاں نہ چور بھی چھپنے پائیں
کالی اور سیہ راتوں میں
آدمیوں کی ٹوہ میں رہنا
یونہی اشرف خود کو کہنا

حامد کرنارپوری

غزل

جو بھی اس کے پیارے نکلے
دکھ اور درد کے مارے نکلے

وہ دنیا کو جیتے' جو بھی
پیار کی بازی ہارے نکلے

گرے ہیں جو تیری نظروں سے
بن بن کر وہ تارے نکلے

چلے ہیں مشکل راہ پہ جو بھی
وہی تو تیرے دوارے نکلے

علی محمد ملوک

غزل

دیکھنے میں تو پوری ہے
ہر تصویر ادھوری ہے

رنگ چڑھائے سوچوں پر
آنچل جو انگوری ہے

لالی چمکے گالوں پر
جیسے آم سندھوری ہے

سوچ پسینہ ماتھے پر
حرفوں کی مزدوری ہے

دل کے ہیں نزدیک ملوک
ویسے کتنی دوری ہے

ولی محمد واجد

غزل

کالے پھنیئر جیسی شو کے سخت اندھیری رات
روشنی ڈھونڈنے والے لوگو! دو اب لہو زکات

ہر جانب اک ہو کا عالم کوئی نہیں ہے باہو
چپ کے تالوں کو جو توڑے کون کرے وہ بات

محرومی مجبوری چھتنا صدیوں کا یہ کرب
میں تجھ کو واپس کردوں گا تیری یہ سوغات

لکھ نہ سکا میں دل کی باتیں خط میں کرنا معاف
تیرے میرے دشمن لے گئے مجھ سے قلم دوات

اپنے من میں وحدانیت اچھی طرح رچاؤ
پل بھر میں پھر ٹوٹتے دیکھو سارے لات منات

شرتی آگھ کے اندر ڈوب کے اپنی پیاس بجھا
دُکھ کے اس ظلمات میں واجد یہ ہے آب حیات

صحرائی گورداسپوری

غزل

خوشیوں سے چہرے کو سجائے پھرتا ہوں
اپنے دل کا کرب چھپائے پھرتا ہوں

جگ کے میلے کی پُر رونق راہوں میں
تنہائی کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں

تو تو ہوش کے تخت پہ ٹھاٹھ سے بیٹھا ہے
میں لیکن سب حال گنوائے پھرتا ہوں

اپنی ساری ہنسی کو تجھ پر وار دیا
یاری اب آہوں سے لگائے پھرتا ہوں

منہ پر میرے اللہ اللہ رہتا ہے
بغل میں ہر دم چھری چھپائے پھرتا ہوں

شبنم شکیل

غزل

آج سہاگن روپ سجا کے جو کہتی ہے رات سنو
خوشبوؤں کو چھو کے دیکھو اور رنگوں کی بات سنو

آنکھ میں گجرا بانہہ میں گجرا سرخی مل کر ہونٹوں پر
جو کہنے میں آئی ہوں وہ سارے ہی جذبات سنو

دیپ جلیں اور پھول بھی مہکیں بیٹھ کے اک جانب چپ چاپ
چھیڑ کے کوئی راگ سریلا آنکھوں کی ہر بات سنو

یہ میرے بچپن کی سہیلی مرے غم کی ساتھی ہے
کیوں میری کھڑکی سے لگ کر روتی ہے برسات سنو

اب تو ایک زمانے سے دل شبنم چپ چپ رہتا ہے
پاس بلاؤ اس کو بھی اور اس کے بھی حالات سنو

ابوالامتیاز ع۔س۔مسلم

حمد

پہلا نام اللہ کا ہے رحمٰن جو ہے کہلائے
بخشش اور رحمت کی بارش بندوں پر برسائے

ساری حمد و ثنا ہے اس کی پالنہار جو سب کا
رحم و کرم ہے چھایا ساری دنیاؤں پر رب کا

مالک ہے تُو یوم حساب کا کوئی نہ تیرا ساجھی
بےعملوں کے بیڑے کا اب کون ترے بن مانجھی

تیری عبادت کرتے ہیں ہم تیرے آگے جھکتے
اپنے لئے ہم ہر امداد کو مانگتے ہیں بس تجھ سے

ہم عاجز بندوں کو رکھنا سیدھی راہ خدایا
جس رہ پر ہے تیری رحمت اور بخشش کا سایا

جس پر چلنے والوں کو ہے حاصل تیری نعمت
جن پر ہر دم رہتی ہے بس تیرے فضل کی برکت

ہم کو بچانا ان کی راہ سے غضب ہے جن پر تیرا
وہم وگماں میں بھٹک رہے ہیں جن کا نصیب اندھیرا

فخر زمان

ڈرائنگ روم میں چڑیا

سارے رستے بند کرو
دروازے کھڑکیاں روشندان
اس کو پل بھی نہ بیٹھنے دینا
خود ہی تھک کر گر جائے گی

افضل احسن رندھاوا

نظم

لوگو!
اس کو کچھ نہ کہو تم
اس کو کچھ مت پوچھو
میں نے بدن کے داغ یہ سارے
خود ہی مول لئے ہیں
اپنے چہرے کی یہ لکیریں
میں نے خود کھینچی ہیں
اپنی آنکھوں کے یہ حلقے
میں نے پیدا کئے ہیں
میرے بالوں میں یہ سفیدی
دھوپ میں پھر پھر کر آئی ہے

آنکھ کا نور

نا وہ مجھ کو بھولا
نا میں اس سے دور
افضل احسن!
رب کی آنکھ کا
میں دھرتی پر نور

یاری

میرے سر پر رکھ دو سارے
اپنا اپنا بار
پر اک بار تو سچے دل سے
کہہ دو مجھ کو یار

شفیع عقیل

سوچ کا پتا

دل کی کھڑکی کھول ذرا تو
ہوا کا جھونکا آئے
تیری سوچ کا سوکھا پتا
اڑتا اڑتا جائے

سماں

برسوں بعد ملی وہ لڑکی
روپ سہا نہیں جائے
پگلے لوگ کہیں یہ پھر بھی
سماں نہ مڑ کر آئے

دشمن

دن میں کیا کیا سپنے دیکھوں
رات مگر جب آئے
نیند کا ایسا زہر پلائے
لوٹ کے سب لے جائے

بشیر حسین ناظم

سوکھے ڈال کا اشارہ

تو نے میری چپ جو نہ سمجھی
ایک بھی حرف اے میرے یار!
ساری عمر نہ سمجھے گا

قربت

آنکھوں پر اک ورق جو رکھیں
کوئی حرف بھی نظر نہ آئے
وہ نزدیک جو جان سے بھی ہو
چھپ کر علم گیان سے بھی ہو
کیسے نظر وہ آ سکتا ہے؟

امین خیال

غزل

تری طلب سے بڑھ کر مجھ سے اور سوال نہ ہوگا
تیرے درد کی دولت دے کر دل کنگال نہ ہوگا

سو سالوں کے بعد ہی جا کر ایک صدی بنتی ہے
صدیاں ہو جائیں گی اک دن پھر بھی سال نہ ہوگا

اس کا کوئی سنگی ساتھی کیسے ہو سکتا ہے؟
جس بے کس کی جیب میں یارو زر اور مال نہ ہوگا

طارق عزیز

غزل

گناہ کیا ہے ثواب کیا ہے — یہ فیصلے کا عذاب کیا ہے
اگر ہیں اتنے ہی حرف مشکل — تو پھر یہ جگ کی کتاب کیا ہے
میں سوچتا ہوں کہ چار دن بس — یہ خواہشوں کا حساب کیا ہے
یہ سارے دھوکے یقین کے ہیں — نہیں تو شاخِ گلاب کیا ہے

مقبول احمد

ہائیکو

نئی رت کا تھا انتظار بہت
لیکن آئی بہار یہ کیسی
پھول شاخوں پہ اور کملائے

اندر اندر گھٹتا جاؤں
جیسے میرے ہاتھوں میں
سلگ رہی ہو کوئی سگریٹ

تنہائی کی آگ

گہری فکر اور سوچ کے
کتنے دیئے جلائے میں نے
پھر بھی سمجھ میں بات نہ آئے
تنہائی کی آگ ہے سلگے
کیوں میرے آنگن میں

عزت کا معیار

انسانوں کا کال پڑا ہے
اب تو عزت کا معیار
دولت سامنے رکھ کے
پرکھا جاتا ہے

غزل

کل اک عجب تماشا دیکھا
دریا خود ہی پیاسا دیکھا

بھرے ہوئے بازاروں میں بھی
ہر اک شخص کو تنہا دیکھا

سارے غرضوں کے بھوکے تھے
قول کے اک اک رشتہ دیکھا

پیچھے پیچھے عکس تھا مرا
آگے اپنا سایہ دیکھا

جل تھل تھا دل کے صحرا میں
خشک آنکھوں میں دریا دیکھا

ہر صورت میں نقش تھا اس کا
ہر جانب وہ چہرہ دیکھا

غزل

سبق یہی پڑھایا تھا مرشد نے اور کہا تھا اسے بسارنا مت
بازی ہارتے ہارتے ہار جانا قول دے کے کسی کو ہارنا مت

لہریں کتنی بھی ہوں منہ زور لیکن زور بازو پہ اپنے ہی تیرنا ہے
دور ساحل پہ بیٹھے شناوروں کو کبھی مدد کے لئے پکارنا مت

عزت اور انا کے کھیل میں تم سیدھی سوچ پہ قائم سدا رہنا
وقت برے سے برا بھی آئے اگر رنگ بدلنا اور روپ دھارنا مت

دیپ بجھنے نہ دینا اصول والا سبق بھولنا نہیں وضعداریوں کا
قول پورا عمل کے ساتھ کرنا کبھی صدق کو جھوٹ پہ وارنا مت

عنوان

سوچ رہا ہوں
اس کو کن خوشبوؤں کا عنوان لکھوں
جس نے پہلی بار مجھے
مجھ سے بڑھ کر چاہا تھا

تازہ مُورت

دل کے رستے گلیوں جیسے
زخم جگر کے کلیوں جیسے
درد و الم ہیں روح میں پگھلیں
برف کی کچی ڈلیوں جیسے

غزل

آنکھوں میں ملہاریں جاگیں
نس نس درد بہاریں جاگیں

جب بھی سواری شعر کی آئے
سوئی سوچ قطاریں جاگیں

من میں ہو کی لاٹ جو اترے
روح کی سوئی ناریں جاگیں

سوچ کے پنچھی جاگ اٹھتے ہیں
فکر میں جب چیکاریں جاگیں

دلدل

لہو کی ظالم دلدل پر
کوئی پیر جما نہیں سکتا
ظلم کے کالے دھندے میں
کوئی خیر کما نہیں سکتا

ذکر

عقل کا جلتا شعلہ لا
فکر کا دیپک روشن ہو
تیلی ایسی کوئی جلا
ذکر کا دیپک روشن ہو

عمل

بنا عمل
کچھ پھل نہیں دیتے
علم کے خالی پیڑ

نعت

غوطہ مار کے پیار سمندر سے موتی لے آؤں میں عقیدتوں کے
کرے غرق جو بحرِ فنا مجھ کو کھل جائیں گے راز حقیقتوں کے
لکھوں نعت تو لکھوں میں کیسے آقا حرف حرف پہ قلم بہک جاتا
تری نعت کا ہے آغاز جہاں میرا فن ہے وہاں انجام پاتا

نظم

کالے کالے سایوں کے جنگل میں چاروں جانب
کس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے آپ سے ڈرتا
اپنے لہو کی دلدل میں ہوں آذر اتنا ڈوبا
یہ نہ سمجھ میں آیا اب تک جیتا ہوں یا مرتا

غزل

محبت کا ہم کو صلہ مل گیا ہے
یہ تم کیا ملے ہو خدا مل گیا ہے

نگاہوں سے ایسی ہے تم نے پلائی
ہمیں عمر بھر کا نشہ مل گیا ہے

بھٹکتا تھا دنیا کے صحرا میں تنہا
مگر اب تو اک قافلہ مل گیا ہے

بھلا موت کی اب مجھے کیا ضرورت
کہ اب زندگی کا پتا مل گیا ہے

نہیں چاہئے اب کوئی بھی سہارا
کہ اب یار کا آسرا مل گیا ہے

غزل

تتلی جگنو پھول ستارے تیرے نام
رکھے یاروں نے کیا پیارے تیرے نام

اپنی تو ہر شے ہی ساجن! تیری ہے
ساری خوشیاں غم ہیں سارے تیرے نام

کالے لیکھ اماوس جیسے میرے سنگ
چاند اور سورج کے نظارے تیرے نام

ہر دم بہتے ہیں جو آنسو آنکھوں میں
تیرے نام یہ امرت دھارے تیرے نام

پیار خلوص محبت چاہت میرے ڈھنگ
جھوٹے وعدے جھوٹے لارے تیرے نام

کلیم شہزاد

غزل

تجھ کو سکھایا کس نے ہے ساجن بسارنا
آنگن میں دل کے درد کے سورج اتارنا

منظر وہ کیسے بھولے گا برسوں کے بعد بھی
شاموں کو تیرا کھیل کی خاطر پکارنا

خاموشیوں کے شہر میں مشکل ہے کس قدر
پلکوں پہ آدھی رات سمندر اتارنا

سولی پہ چڑھ کے وقت کی ہستی کو وار کے
ہم کو ہے تیرے پیار کا صدقہ اتارنا

اس کھیل کا عجیب ہے جادو کلیم کو
خوشیوں کے ساتھ پڑ گیا جیون کو ہارنا

حنیف صوفی

غزل

پیٹ کی خاطر لوگوں نے کیا کیا ہیرے گروی رکھے
ہوٹل پر ہیں چھوٹے چھوٹے بچے گروی رکھے

بیٹی کی شادی پر ماں کی سوچ نے عزت رکھی
آدھے گہنے لے دئے اور آدھے گروی رکھے

دیکھنے کو ہیں چٹے کپڑے کہنے کو خوشحالی
کس نے کوٹھے کس نے اپنے رقبے گروی رکھے

سعد اللہ شاہ

غزل

موسم تیرے آنے سے
موسم تیرے جانے سے
بندہ تنہا رہ جائے
بہت سے یار بنانے سے
آنکھوں میں ویرانی ہے
کالے بادل آنے سے
کتنوں کی پہچان گئی
اپنا رنگ جمانے سے
پہلی بات نہیں رہتی
اور بھی بات بڑھانے سے
اور بھی وہ یاد آئے گا
یوں اے شاہ بھلانے سے

غزل

جانے اپنی بستی میں سے کیا بنجارے لے گئے ہیں
ہم سے کتنے روٹھے موسم ہجر کے نظارے لے گئے ہیں

رہے چمکتے آس کنارے رت کے گھپ اندھیاروں میں
دن کے اجالے ایسے آئے اتنا تارے لے گئے ہیں
اک دوجے سے رہ کے الگ بھی دیواریں تو سانجھی تھیں
نئے محلے ہم سے یہ بھی سانجھ سہارے لے گئے ہیں

بات تو سن لیتے تھے پہلے گونگی بستی کے یہ لوگ
کون ہیں جو ان کی آنکھوں سے درد ہمارے لے گئے ہیں

شاؔد میں اپنے گھر کی چھت کو سر پہ اٹھائے پھرتا ہوں
دیواریں تو سب قبروں کے مٹی گارے لے گئے ہیں

گاؤں کی ہیر

سوچوں کے بیلے میں بیٹھی
چور آنکھوں سے دیکھے
کبھی تو اپنا منہ شیشے میں
کبھی مری تصویر
میرے گاؤں کی اک ہیر

گھر کی نالی

اونچی دیواروں کے اندر
جسے چھپاتے ہیں ہم لوگ
اس کو باہر لے آتی ہے

بیری

میرے گھر میں ہے اک بیری
رات کو ہرگز سو نہ سکوں میں
بٹ بٹ دیواروں کو تکوں میں
بیری بڑھتی جائے
مجھ کو کچھ نہ آئے
کس کو روکوں
کس کو ٹوکوں
کوئی نہ پتھر مارے

نیم پلیٹ

دروازے پر اسے لگاؤ
اپنا آپ چھپاؤ
جو چاہو بن جاؤ

کالی رات کا شور

یاد پکھیرو اڑ اڑ آئیں
دل آنگن میں شور مچائیں
ان کے ساتھ نہ بول سکوں میں
بٹ بٹ بس آکاش تکوں میں

ساقی گجراتی

غزل

بیتے لمحوں کی صدا سوچ کا جادو بن کر
میرے چوگرد چھنکتی رہے گھنگھرو بن کر

مورتیں ذہن کے ورقے پہ بنائیں کیا کیا
رنگ بن کر کبھی اس شخص نے خوشبو بن کر

دل کے زخموں کے چمن جاگ اٹھے ہیں شاید
رنگ بکھرا ہے مری آنکھ سے آنسو بن کر

یاد آئی ہے تری درد کے لشکر کی طرح
دل کا بغداد اجاڑے گی ہلاکو بن کر

پیار نگری کے مکینو ذرا ہشیار رہو
پھر نہ آ جائے لٹیرا کوئی سادھو بن کر

علم کے عرش پر چمکے ہیں ستارے کیا کیا
کوئی وارث کوئی بلھا کوئی باہو بن کر

غزل

عیدیں اور شبراتیں تیرے نام کروں
جگمگ دن اور راتیں تیرے نام کروں

گزرے ہوئے سب لمحے تجھ پر واروں میں
بھولی بسری باتیں تیرے نام کروں

کھل جائیں گر پھول کروں میں پیش تجھے
مہکی یہ سوناتیں تیرے نام کروں
کن من کن من برسوں تیری دھرتی پر
چھم چھم یہ برساتیں تیرے نام کروں

حرف کے تختے بن جائیں جاگیر تری
سخن کی یہ سوناتیں تیرے نام کروں

غزل

غم عمروں کو کھا جاتے ہیں
تن کا لہو سکھا جاتے ہیں

عشق کا روگ ہے جب لگ جاتا
ہنسی کو لوگ بھلا جاتے ہیں

غیرت آن ہے زر سے بجتی
فاقے آن مٹا جاتے ہیں

یادوں کے بادل آنکھوں میں
بارش سی برسا جاتے ہیں

کچھ دن دور رہے ہیں مجھ سے
اب خوابوں میں آجاتے ہیں

سکھ یاد آئیں جب بھی اذفر
دل کا چین گنوا جاتے ہیں

غزل

بات جو ہر اک سانچے میں ڈھل جاتی ہے
مجھ کو ایسی بات بھی کرنی آتی ہے

مانا فائدہ کوئی نہیں ہے بولنے کا
پر یہ چپ بھی سچ کی عمر گھٹاتی ہے

یہ مت سوچو نہیں سنے گا جگ میری
ہونٹ ہلیں تو دھرتی بھی ہل جاتی ہے

جب میں عمر سے بڑھ کر باتیں کرتا ہوں
وہموں کی صورت میں موت ڈراتی ہے

ہر سو لال گلابی لاشے لگتے ہیں
وقت کی آندھی اتنا خون اڑاتی ہے

سانسوں کی آخری منزل

میں اور وہ جذبات کی رہ پر
چلتے چلتے خوابوں کے سنگ
پیار اور شک کے بیچ
وہاں آ پہنچے ہیں
جہاں فراق کو سہہ نہیں سکتے
مل کر باہم رہ نہیں سکتے

ڈاکٹر خان محمد ساجد

غزل

ہے بہار ہر طرف بلبلوں کا دور ہے
پر مرے سماج میں نفرتوں کا دور ہے

جنگ کی لپیٹ میں امن کی ہے فاختہ
ہر طرف دلوں میں اب کدورتوں کا دور ہے

اب تو آنا چھوڑ دے یار خواب میں مرے
اب مرے خیال میں حسرتوں کا دور ہے

کل بھی میرے دیس میں شورشوں کا شور تھا
اب بھی میرے دیس میں شورشوں کا دور ہے

شفیق آصف

غزل

کیا جانیں وہ کیا بیتے صحراؤں میں
بیٹھے رہے ہیں سدا جو ٹھنڈی چھاؤں میں

ہر دم پیڑ دعاؤں والے تازہ ہیں
بات ازل سے دیکھی ہے یہ ماؤں میں

دیا ہے میں نے اپنے خون کا نذرانہ
دیے جلائے میں نے تیز ہواؤں میں

جتنی بھی کوشش کی ہے غم ٹل جائے
اور اضافہ ہوا ہے درد سزاؤں میں

غوطے کھا کھا کر آخر تیراک ہوئے
آصف عمریں گزریں غم دریاؤں میں

سرائیکی شاعری

کافی

چھپ کر آیا یار واہ وا عجب تماشا
ہر ہر طرف بہار واہ وا عجب تماشا

آپ ہی دیکھے آپ دکھائے
اس کی رمز نہ کوئی پائے
شیشہ اپنا آپ بنائے
خود دیکھے دیدار واہ وا عجب تماشا

یوسف بن کر دیس بھلایا
جوتھا کبھی یعقوب کا جایا
کنعاں سے وہ مصر کو آیا
اور بکا بازار واہ وا عجب تماشا

سی حرفی

الف اِدھراُدھر ہمیں آس تری اور آسرا تیرے ہی زور کا ہے
سب تیرے حوالے ہیں ڈھور ڈنگر ہمیں خوف نہ اب کسی چور کا ہے
تو ہی جان سوال جواب سارے ہمیں ہول نہ اب ذرا گور کا ہے
علی حیدر کو ہے بس چاہ تری وہ نہ سائل کسی بھی اور کا ہے

میم مذہب کیا پوچھے ہے میرا رانجھا رکن ایمان کا ہے
ہے عشق امام نماز محبت مُرلی حرف قرآن کا ہے
ہر وقت رکوع سجود میں ہیں سجدہ تو رب رحمان کا ہے
ہے ہیر تو رانجھے کی علی حیدر یونہی جھوٹا وہم جہان کا ہے

❁❁❁

کافی

تاب سے ہوں بےتاب میاں، ہوں تاب سے میں بےتاب

نا میں گویا نا میں جو یا ناہوں ہوں سوال جواب
نا میں خاکی نا میں بادی نا میں آگ نا آب
نا میں جن ہوں نا انسان ہوں نا ہوں ماں نا باپ
نا میں سنی نا میں شیعہ نا ہوں پاپ، ثواب
نا میں شرع نہ ورع کا قائل نا ہوں رنگ رباب
نا میں ملا نا میں قاضی نا ہوں شور شراب
ذات سچل کی کیا پوچھو ہو وہ تو ہے نایاب

❁❁❁

بیت

آمل ماہی مجھ کو میں ہوں پیاسی ترے درس کی
گھڑی گھڑی تجھ بن ہے ایسے جیسے ایک برس کی
جھلک دکھا دیدار کی اپنے سن فریاد جرس کی
آجا اب تو خوشدل مجھ پر نظر ہو رحم ترس کی

لطف علیؒ

بیت

یار میرے کی شان تو دیکھو حسن کا ہے وہ شاہ
ہوا چکور مرا من اس کا دیکھ کے رشک ماہ
روح عشاق کی حسن کے در پر دی ہے دکھائی واہ
سخت بہت ہے ان کی خاطر ہجر و فراق کی راہ
ایک قیامت لال لبوں کی آگے ذقن کا چاہ
لطف علی کیا ہوگا دیکھیں پریم کی ہے درگاہ

کافیاں

(کیا عشق اڑاہ مچایا ہے)

دل وجاں میں قیامت سی بپا ہے
غم الفت مسلسل بڑھ رہا ہے

لگی ہے آتش غم تن بدن میں
جوانی جل گئی دل کی جلن میں
سوائے غم ہے کیا دیوانہ پن میں
غم دل ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے

وہ جب سے چھوڑ کر تنہا گیا ہے
شب غم نے مجھے اپنا لیا ہے
یہ پھولوں کا گلے میں ہار کیا ہے
کوئی افعی ہے ڈستا جا رہا ہے
غم ہجراں کے ہیبت ناک تیشے
وہ میرے ناتواں دل پر چلا کے
سرے سے میری الفت کو بھلا کے
خدا جانے کہاں پر جا بسا ہے

دل پُر غم اسیر عاشقی ہے
ازل سے یہ کسک اسکو ملی ہے
مری ہستی سراپا تیرگی ہے
اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے

تباہی ہے کسی سے دل لگانا
خوشی دینا غموں کا زہر پانا
یہی بس درد سہنا غم اٹھانا
غلط جو اس فسوں میں آ گیا ہے

فریدؔ خستہ جاں! یہ کیا ہوا ہے؟
سحاب درد دل پر چھا رہا ہے
نظر سے رنگِ آرائش مٹا ہے
سکونِ قلبِ رخصت ہو چکا ہے

(ہے ہے یار بروچل ہک تل ترس نہ کیتا)

ہائے یار بلوچا تو نے
مجھ پر کوئی رحم نہ کھایا

چھوڑ دیا ہے مجھ بے بس کو
تجھ کو میرا ساتھ نہ بھایا

روز ازل سے مجھ دکھیا کو
عشق نے ہجر کا جام پلایا

جس دن سے سانول بچھڑا ہے
جیون سکھ بیتا دکھ آیا

درد و الم کی شدت دیکھو
رگ رگ میں ہے درد سمایا

پریم کی آگ لگا کر دل میں
پریتم نے ہے مجھے بھلایا

کوہ و دمن میں سرگرداں ہوں
مرنے کا پیغام نہ آیا

(درد اندر دی پیڑ ڈاہڈا سخت ستایا)
دردِ فرقت نے سخت تڑپایا
عشق دکھیا دلوں کی شادی ہے
عشق رہبر ہے عشق ہادی ہے
عشق مرشد ہمارا عشق ہے پیر
جس نے راز حیات سمجھایا

یہ دل زار یہ ہمارا دل
پیدا ہوتے ہی ہو گیا گھائل

روز اول ہی سے طلب کا تیر
حسن محبوب نے ہے برسایا

ناز و غمزۂ تبسم پنہاں
کج ادائی، نظارۂ جاناں
حسن کے شہر کے ہیں چار امیر
رعب جن کا ہے چارسو چھایا

آج دامن میں دشت روہی کے
ریت بھیگی ہوئی ہے بارش سے
ہر قدم تازگی کی ہے تصویر
بخت جاتا ہوا پلٹ آیا

ہر طرف ہے فریدؔ آبادی
خشک پودوں پہ چھا گئی خنکی
ہر ندی بن گئی ہے جوئے شیر
ہم نے شاداب ماڑ کو پایا

(کوئی ماہنوں آ ءمیں یاردا)

سینے میں دھڑک رہا ہے
یار کا قاصد آ پہنچا ہے
عشق نہیں ہے تیر ہے کوئی
دل پر کاری زخم لگا ہے
درد محبت کے شعلوں میں
تن من جل کر راکھ ہوا ہے
نازک دل میں کب ہمت تھی
یار کی خاطر درد سہا ہے
یار فریدؔ اب زخمی کرکے
دل کو تنہا چھوڑ گیا ہے

(نیناں نہیں رہندے ہٹکے)

روکے نہیں رکتے نین
لڑتے ہیں کیا ناز و ادا سے
نینوں سے یہ نین
قریہ قریہ بستی بستی
عشق ہوا بے چین
کرکے یاد سجن کی باتیں

روتی ہوں دن رین
ہر دم آنسو نالے آہیں
کرتی ہوں میں بین
تجھ سے جدا ہو کر یہ جیون
کتنا ہے بے چین

(رتھ دھمی دھمی ٹور)

اے رتھ بان!
آہستہ آہستہ چل
ٹوٹ نہ جائیں چوڑیاں میری
ہو نہ کہیں نقصان ......اے رتھ بان آہستہ آہستہ چل
طوق عشق گلے میں میرے
عشق کا ایک نشان۔اے رتھ بان! آہستہ آہستہ چل
رہ میں ہیں رہزن، بچ جائے، میری
الفت کا سامان۔اے رتھ بان! آہستہ آہستہ چل
تھک گئی تو میں گھوڑا لوں گی
تیز قدم آسان۔اے رتھ بان! آہستہ آہستہ چل
رب نے مجھے، محبوب کو رکھا
دو قالب یک جان۔اے رتھ بان! آہستہ آہستہ چل
آس ہے اس کے وصل کی شاید
نکلیں سب ارمان۔اے رتھ بان! آہستہ آہستہ چل

ہیر

پہنچی ہیر بلوغت کو جب آئی خوب جوانی
حوریں تھیں انگشت بدنداں دیکھ پری مستانی
زلف سیہ تھی خوب تھیں پلکیں ابرو مثل کمانی
آنکھیں خوب فراخ منور بہت کھلی پیشانی
دانت ستارے چمکیں جوں دُرمکنوں قرآنی
خوب تھی لال لبوں پر لالی منہ تھا سب نورانی

خیر شاہ

دوہڑا

نورِ نقاب دلبر دیکھ کے ہوئی ہمیں حیرانی
سمجھ نقاب کی جن کو آئی پایا راز نہانی
ناداں بھی پھر دانا ہو کر سیر کریں لاثانی
خیر جہان مکان ہے اس کا اس کی ہے سلطانی

غزل

بہت ہی دل کا امیر ہوں میں
کہ ان کے در کا فقیر ہوں میں

جو ان کے در کو دیئے ہیں بوسے
تو کتنا روشن ضمیر ہوں میں

غبار کے ساتھ ہوں میں رقصاں
جنوں کے صحرا کا میر ہوں میں

لیا ہے جان اپنے آپ کو یوں
کہ مخفی راز قدیر ہوں میں

قطعہ

مجھے رکھ غمگیں مجھے شاد نہ کر
مری اجڑی جھوک آباد نہ کر
اس زلف سیہ کے ساتھ تجن
مجھے باندھے رکھ آزاد نہ کر

بحضورِ عشق

آ مرے عشق آ مرے اجڑے ہوئے گھر کی بہار
آ غریبوں کے سہارے' بے کسوں کے غم گسار
آ مرے سینے کی ٹھنڈک' آ مرے دل کے سرور
آ مرے اخلاص کے دیپک' مری آنکھوں کے نور
آ مرے اشکوں کی رم جھم کے رسیلے جلترنگ
آ مرے احساس کے پگھلے ہوئے سونے کے رنگ
آ مری راتوں کے ساتھی آ مرے دن کے حبیب
آ قناعت کے پیمبر آ مروت کے نقیب
تیرے قدموں کی بدولت فقر کا شاہی مزاج
تو رکھے فاقہ کشوں کے سر پہ خودداری کے تاج
آ مرے کنعاں کے یوسف' آ زلیخا کے جمال
آ مرے بازار کی رونق مرے فن کے کمال
بے وسیلوں کے وسیلے بے وقاروں کے وقار
شعر کی دنیا کے خالق' فکر کے پروردگار
یہ اندھیروں کے سمندر' یہ جہالت کے نگر
کون لے تیرے سوا مجبور شاعر کی خبر؟

تنہائی

مجھ کو بے یارو مدد گار نہ تنہا سمجھو
ہر گھڑی ساتھ مرے رہتی ہے محفل میری
تو مری خاک نشینی پہ بہت رحم نہ کھا
تیری سوچوں سے بہت دور ہے منزل میری
مجھ کو انسان کا غم دیتا ہے نغمے غم کے
مجھ کو یہ ایسے مقامات پہ لے جاتا ہے
جہاں لاہوت کی منزل کے پیام آتے ہیں
مجھ کو گزرے ہوئے لوگوں کے سلام آتے ہیں
میرے گھر نور کی برسات کی رت آتی ہے
رات کو عرش سے پریوں کے کھٹولے اتریں
ساز پازیبوں کی جھنکار کی لے پر گونجیں
رنگ اور نور کے ہر سمت ہیولے ناچیں
میری تنہائی کے غم خوار ادھر آتے ہیں
سامنے رومی و اقبال نظر آتے ہیں
اک طرف ہوتے ہیں عرفی بھی نظیری بھی مرے
روز میں حافظ و خیام کی مے پیتا ہوں
میرے گھر وجد کی عرفان کی موج آتی ہے

لگتے ہیں شعر کے اور فن کے تجلیے میلے
طاہرہؔ درد کے سازوں پہ غزل گاتی ہے
یہ خدا مست یہ خود دار یہ نوری بندے
میری تنہائی کو غیرت کا سبق دیتے ہیں
دیر تک ہوتی ہیں عرفان کی باتیں ان سے
رات ڈھلتی ہے تو یہ لوگ چلے جاتے ہیں
ایسے فنکاروں سے ہو پیار کی سنگت جس کی
کیا ضرورت کہ وہ بے ذوق زمانے میں رہے
کیا غرض اس کو کہ تنہائی کی محفل چھوڑے
کسی زردار کے حاکم کے ٹھکانے جائے
ایسی تنہائی پہ سو محفلیں قربان کروں
ایسی تنہائی پہ صدقے ہوں ہزاروں جلسے
میری تنہائی کو اللہ نے شاہی بخشی
میری تنہائی کی رونق کو سکندر ترسے

❁❁❁

ارشد ملتانی

سفر کی ایک رات

جس جانب بھی غور سے دیکھوں
چپ کی چادر منہ پر رکھے
ادھر ادھر سارے ہی مسافر
نیند کے خراٹوں میں گم ہیں
لمبے لمبے سانس ہیں لیتے
یہ آوازیں یوں آتی ہیں
جیسے میرے چاروں جانب
رات کے بشیر ناگ پھنکاریں
کالے کالے دیو پکاریں
میرے مولا میرے ربا
رات بھلا یہ کب بیتے گی؟
گاڑی منزل پر پہنچے گی

غزل

کر فکر تو اس اک پل کا
کیا قصہ ابد ازل کا

تو بات کرے صدیوں کی
یاں جھگڑا ہے پل پل کا

اک غضب ہے آگ بدن کی
دوجا چولا ہے ململ کا

کوئی انت تو آخر ہوگا
اس دنیا کی ہلچل کا

ہے ساتھ ہمیشہ ارشد
اس سوہنے یار پنل کا

نقوی احمد پوری

غزل

ایسا جنوں ہو مجھ کو بالکل رہے نہ ہستی
ساقی پلا دے ایسی اترے نہ جس کی مستی

میں ایسا مٹ گیا ہوں خود حسن بن گیا ہوں
گر یہ ہے بت پرستی چھوٹے نہ بت پرستی

زاہد کو کیا خبر ہے کیسی مری نظر ہے؟
عرفان میری وحشت مستی مری الستی

اَن دیکھی ذات کو تو کرتا ہے روز سجدے
زاہد! عجیب دیکھی تیری خدا پرستی

گر چہ فقیر ہوں میں دل کا امیر ہوں میں
صدقے ہے سربلندی کیسی ہے میری پستی

غزل

کاغذوں پر عیش کے کچھ غم کی تحریریں بھی ہیں
دل کی دیواروں پہ کچھ رنگین تصویریں بھی ہیں

من پسند اپنے تصور کے اجالے پر نہ جا
زندگی کے خواب کی کچھ اپنی تعبیریں بھی ہیں

لاکھ تو کوشش کرے چھپنے کی ہم سے جانِ جاں
بال سے باریک کچھ نظروں کی زنجیریں بھی ہیں

عشق مقتل کی طرف اک راہ ناہموار ہے
حسن کی زلفوں کی لٹ میں تیز شمشیریں بھی ہیں

ہائیکو

وقت نے اب ہوا کے کاغذ پر
ایسا اک خط بھی تجھ کو لکھا ہے
جس کو پڑھ کر اداس ہے موسم

اب تو آموں پہ بور آیا ہے
اب تو خوشیاں بھی عام ہیں ہر سو
اب تو آ جا کہ مست دھرتی ہے

تیری زلفوں پہ رات اتری ہے
تیرے چہرے نے دھوپ کے رخ کو
روشنی کا لباس بخشا ہے

ہو کا عالم ہے بیقراری ہے
دیکھتا ہوں جو اپنے سینے میں
دل کا ملتا نہیں نشاں مجھ کو

ہاتھوں پہ چاند

کارنس پر رکھا ہوا کاغذ
موم الفاظ سے منور ہے
تیرا خط نور میں نہایا ہے
میری خوشیوں کی حد نہیں کوئی
آنکھیں پروانہ وار ہر جانب
ہو کے قربان چومتی ہیں اُسے
میرے ہاتھوں پہ چاند اُبھرا ہے

شرارتی لفظ

یہ لفظ کتنے شرارتی ہیں
کروں جو تعریف حسن کی میں
قلم کے آگے دھمال ڈالیں
یہ جھوک کاغذ کی آ بسائیں
محبتوں کے وہ گل کھلائیں
کہ جن کی خوشبو
کتاب دل کو بکھیرتی ہے
ہوا کی صورت
یہ چھیڑنے بار بار آئیں
یہ لفظ کتنے شرارتی ہیں

دلدار بلوچ

غزل

جب تھام کے روتا ہوں سیہ رات کا دامن
آنکھیں بھی پکڑ لیتی ہیں برسات کا دامن

اب سوچ کے ویران ہوئے سارے سہارے
چھوٹا ہے مرے ہاتھ سے حالات کا دامن

جس رات مرے پاس ہو ساجن مرا مہماں
بھر دوں گا میں خوشبوؤں سے اس رات کا دامن

ہوں شانوں پہ میرے جو پریشان وہ زلفیں
اللہ کی قسم چھوڑوں نہ اس رات کا دامن

چاہے ترے ہر سمت ہوں بکھری ہوئی خوشیاں
دلدار نہ چھوڑ آہوں کی سوغات کا دامن

غزل

جو بھی تیرا غلام ہو جائے
وہ وفا کا امام ہو جائے

کیا خبر کل وفا کی بستی میں
پیار سی شے بھی عام ہو جائے

تو اشارہ کرے جو الفت میں
ساری دنیا غلام ہو جائے

وہ تو خوابوں کی سیج پر سوئیں
نیند اپنی حرام ہو جائے

چاند اس کی گلی میں جا دیکھیں
اس بہانے سلام ہو جائے

غزل

گرچہ خود کو خوار کیا ہے
پھر بھی تجھ سے پیار کیا ہے
جب بھی درد ملا ہے تازہ
رب کا شکر ہزار کیا ہے

تیری زلفیں ہیں شانوں پر
سانپ گلے کا ہار کیا ہے

پھولوں کی بستی میں ہم نے
پتھر کا بیوپار کیا ہے

وصال موسم کا انکار

کیوں اپنے جذبے برف کریں
کیوں خواہش کو بے فیض کریں
کیوں آس کی حدت میں پگھلے
ہم جسم کو اس گرمی سے بھی محروم کریں
کیوں گرتی ہوئی دیوار کو پھر اک آسرا دیں
کیوں ساون رت کو خط بھیجیں

سب کچھ تیرے لئے ہے

میری آنکھیں تیری دید کی خاطر ہیں
تیرے نام ہی میرے سارے جذبے ہیں
میرے حصے میں جو سانسیں آتی ہیں
سب منسوب میں تیرے نام ہی کرتا ہوں
میرا جو کچھ بھی ہے
سب کچھ تیرا ہے

بھرم

بستی کے ہیں چاروں جانب
چپ کے پہرے
ہر اک چپ ہے
تو بھی چپ ہے
میں کیوں بولوں؟
میں کیوں اپنا بھرم گنواؤں
میں بھی چپ ہوں

غزل

مرا آسرا یہی ہے مرا آخری سہارا
کوئی زندگی کا حیلہ ہے موت کا اشارا

مرے غرق ہونے کا بھی ہے عجیب حال لوگو!
مجھے لے گیا ہے خود ہی طوفان تک کنارا

تجھے بھول ہی گیا ہے شاید وفا کا وعدہ
مجھ کو الف سے لے کری تک ہے یاد سارا

کیسی عجیب دیکھیں جگ میں وفا کی رسمیں
وہی زندگانی کا قاتل وہی جان سے ہے پیارا

روح و بدن میں جلدی اقبال ہو قرابت
اب تو بغیر ان کے ہوتا نہیں گزارا

قطعہ

جنوں کے رنگ آفاقی نہیں ہیں
وہ ساغر اور وہ ساقی نہیں ہیں
جبھی سرور لہو اپنا ہے پیتا
شرابوں میں نشے باقی نہیں ہیں

رشید عثمانی

غزل

قدم قدم پہ محبت کا گیت گاتا چل
بشر بشر کو تو انسانیت سکھاتا چل

اگر ہوا ہے تو چہرے نکھار دے سب کے
اگر بہار ہے گل ہر طرف کھلاتا چل

نہ دیکھ تجھ کو ملے کیا صلہ ترے فن کا
رشید روز نئی اک غزل سناتا چل

دوہڑے

اے جوگی دیکھ کے ہاتھ بتا ہے پیار کی طاق لکیر کہاں؟
ہے جس میں مژدہ وصل کا وہ ہے مالک کی تحریر کہاں؟
سکھ راحت عیش آرام کہاں؟ مرے خواب کہاں تعبیر کہاں؟
یوں طارق نقش کھینچ کہ اس کے پاؤں کہاں مرے نیر کہاں؟

ہیں کون کسی کے کیا لگتے، نہیں جاتی جن کی یاد کبھی
ویرانیوں کو وہ کیا جانیں نہیں جن کا گھر برباد کبھی
ہیں پل دو پل کے راہی وہ چھوڑیں نہ جو غم کا زاد کبھی
پر طارق ایسے لوگ بھی ہیں کرتے نہیں جو فریاد کبھی

غزل

روٹھ جائے وہ اگر مجھ کو ستانے کے لئے
سر کو سجدے میں گراتا ہوں منانے کے لئے

لوگ ہوتے ہیں فقط عیش و مسرت میں شریک
کون آتا ہے کسی کا غم بٹانے کے لئے

عاشقوں کے کیوں نہ اٹھیں پھر جنازے اس جگہ
تو جو بیٹھے حسن کی دولت لٹانے کے لئے

دل کے زخموں کو چھپاتا ہوں خزانے کی طرح
ہر کسی کو یہ نہیں ہوتے دکھانے کے لئے

غزل

دکھ درد کیا سجائے ہیں اپنی دکان میں
میں خود ہی قید ہو گیا اندھے مکان میں

تجھ سے یہ کتنی بار کہا ہے نہ پاس آ
دوں گا میں گھول زہر الم تیری جان میں

شیشے کے گھر سے لوگوں پہ پتھر نہ مار تو
ہو جائے گا شکار وگرنہ مچان میں
یادوں کا عکس چھوڑ گیا ہے وہ بے وفا
میں نے مٹایا نقش تھا اپنے گمان میں

پنچھی اک آرزو کا ہے دل کی منڈیر پر
وہ تیر چھوڑ دے جو بچا ہے کمان میں

پاگل ہوں میں جدائی میں تیری اے رشکِ ماہ
طاہرؔ ذرا بھی جھوٹ نہیں اس بیان میں

غزل

تُو محنت کر تو پھر اس کا صلہ جانے خدا جانے
دیئے کو تُو جلا کر رکھ ہوا جانے خدا جانے

خزاں کا خوف تو مالی کو بزدل کر نہیں سکتا
چمن آباد رکھ بادِ صبا جانے خدا جانے

مریض عشق خود کو کر، دوا دل کی سمجھ دلبر
مرض جانے دوا جانے شفا جانے خدا جانے

جو مر کر زندگی چاہے فقیری ٹوٹکا سن لے
وفا میں تُو فنا ہو جا بقا جانے خدا جانے

یہ پوری ہو نہ ہو، ہرگز نہیں بیکار جائے گی
دعا شاکرؔ تُو مانگے رکھ دعا جانے خدا جانے

غزل

برائی جس طرح کی ہو برائی مار دیتی ہے
خدا تو بخش دیتا ہے خدائی مار دیتی ہے

اگر نیت نہ ہو سچی تو مت پڑھنا نمازِ عشق
دکھاوے کی ہمیشہ پارسائی مار دیتی ہے

یہ تُو بھی جانتا ہے ہجر میں کیا حشر ہوتا ہے
جدائی جان کر مت دے جدائی مار دیتی ہے

یہ شہرت نام اور عزت خدا کی مہربانی ہے
بڑائی چھوڑ دے شاکرؔ بڑائی مار دیتی ہے

اکبر ہاشمی

نسخہ

ہر جا عقل
نہیں کام آتی
یہی ہے عقل کی بات

تریاق

زہر کا اثر جو ختم کرے
وہ تلخی بھی
اچھی لگتی ہے

نصیحت

اس جانب مت سفر کرو تم
جا کر جہاں بھلا دو
اپنے گھر کا رستہ

جھوٹی آس

دنیا سے
بے وفا مانگے
کس سے ہے تو
کیا مانگے؟

تیز تیر

اہلِ ستم کی خاطر
کمزوروں کی آہ ہے کافی
ظلم کی بھٹی میں پکتے ہیں
نفرت کے سب تیر

مطالعہ

میری آنکھیں
پڑھ پڑھ تھک گئیں
کھلی کتاب کی صورت
ہر اک چہرہ سامنے آئے

خالد اقبال

چاند

یوں جیسے آکاش کے دل کو
آئی یاد کس کی

تو جو ہنسے

تو جو ہنسے تو مسکائے
میں پھول چنوں
تو جو چلے مڑ مڑ دیکھے
میں راہ بنوں
تو جو سوئے پھر جاگے
میں خواب بنوں
تو خوشبو سے پُر ساون
میں ساتھ چلوں

سرمئی بادل

سرمئی بادل
ٹولی ٹولی
نیل گگن پر
جیسے میرے دل آکاش پہ
تیری یادیں

❁❁❁

فیض بلوچ

دوہڑہ

مت توڑ یہ کاسہ سائل کا گر بھرتا نہیں خیرات نہ دے
تیرے حسن کی شاہی قائم ہو مجھے درد بھری سوغات نہ دے
ممکن ہو تو جام وصل پلا مجھے اشکوں کی برسات نہ دے
شایاں نہیں اہل کرم کے یوں مجھے دکھ کی فیض برات نہ دے

❁❁❁

غزل

زرد زرد قربتوں کا کچھ بتا
خون خون حسرتوں کا کچھ بتا

چھوڑ چھوڑ دشمنوں کی بات چھوڑ
خار خار دوستوں کا کچھ بتا

پیاس پیاس زندگی کا کیا بتا؟
زہر زہر شربتوں کا کچھ بتا

اشک اشک خواہشوں کا ذکر چھیڑ
گرم گرم صحبتوں کا کچھ بتا

گرد گرد قافلے کہاں گئے؟
چور چور سنگتوں کا کچھ بتا

مست مست حسن کے وقار کی
داغ داغ عصمتوں کا کچھ بتا

قیس قیسؔ کہہ کے رو رہا ہے کون؟
بین بین نفرتوں کا کچھ بتا

غزل

کہا نہ تھا مت ڈھونڈ سہارے راتوں کے
جاگ کے اب تو دیکھ نظارے راتوں کے

تو نے بھی تو عہد کیا تھا ملنے کا
میں بھی گنتا ہوں اب تارے راتوں کے

کتنی ہی پلکوں پر تارے ملتے ہیں
آنکھ جلا کر دیکھ نظارے راتوں کے

میری طرح وہ بھی احساس کے نیزے پر
بہت نہیں دو پہر گزارے راتوں کے

پنجابی افسانے

اکبرلاہوری

چودھری کی بیٹی

رات کا ایک پہر بیت چکا تھا۔ میں نے ہیرا منڈی کے ایک اونچے کوٹھے کے زینے کے آگے لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ میں نے اپنے ایک جاننے والے پان والے سے جو دکان سے اتر کر اس بھیڑ میں جا کھڑا ہوا تھا۔ پوچھا۔''یار یہ کیسی بھیڑ ہے؟'' اس نے کھل کر کوئی بات نہ کی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑ کرتے ہوئے بتایا......''میں نے کوٹھے والی کی ایسی چیخ سنی جیسے وہ کسی کا گلا کاٹ رہی ہو۔ پھر بڑھیا سوٹ پہنے ہوئے ایک نوجوان کو منہ کے بل زینے سے لڑھکتا ہوا دیکھا''۔ پان والے سے اتنی بات سن کر میں بے اختیار آگے بڑھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گرنے والا منہ کے بل زمین پر گرا ہوا ہے۔ اس کے ماتھے کا خون سڑک پر جم گیا تھا اچھے لباس والے کچھ لوگ جن میں ایک دو نے وردی بھی پہنی ہوئی تھی نگاہیں نیچی کئے کھڑے ہیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی کو یہ نہیں سوجھ رہا کہ وہ کیا کرے؟

اتنے میں کوٹھے پر سے ایک عورت کی گونجدار آواز آئی......''اس سؤر کی لاش کو یہاں سے اٹھالو۔ نہیں تو ابھی جلتے ہوئے تیل کی کڑاہی تمہارے اوپر گرا کر تمہیں تماش بینی کا مزا چکھاتی ہوں''اس سے یہ جھاڑ سن کر وہ بھیڑ اس طرح بکھر گئی جیسے آسمان سے گرتی بجلی کے ڈر سے لوگ بھاگ دوڑتے ہیں۔ سفید پوش ساتھیوں نے گرے ہوئے نوجوان کو ہاتھوں پر اٹھایا اور ذرا دور کھڑی ہوئی لمبی سی کار میں جا لٹایا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی جان تو بچ گئی ہے مگر کوٹھے سے نیچے گرتے ہوئے اور سیڑھیوں میں قلابازیاں کھاتے ہوئے اس کے تالو نے سڑک کے ساتھ ایسی ٹکر کھائی ہے کہ سر کا سارا خون نچڑ گیا ہے۔ اس کے ساتھیوں میں سرکاری آدمی بھی تھے۔ مگر اس وقت نہ کسی کے منہ سے کوئی حرف شکایت نکلا نہ کسی نے اونچا سانس لیا۔ چپ چاپ اپنے زخمی اور

بےہوش ساتھی کو اس طرح کار میں ڈال کر لے گئے جیسے کسی پھانسی لگے مجرم کی لاش کو اس کے بد نصیب رشتے دار جیل کے پھاٹک سے دور لے جاتے ہیں۔

میرے دوست پان والے نے میرے لئے پان بناتے ہوئے کہا......''دیکھیں جی کتنی حیرت کی بات ہے کہ عام لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دینے والے اور انہیں گائے بھینسوں کی طرح مارنے پیٹنے والے یہاں آکر خود بھیڑ بن جاتے ہیں۔ اور خاموشی سے مار کھاتے ہیں اور بولتے بھی نہیں۔ آئے دن اس بازار میں یہی تماشا ہوتا ہے۔ بےعزت موری کی اینٹ جیسی دو کوڑی کی طوائفوں اور ان کے غنڈوں سے مار کھانے والے اونچا سانس بھی نہیں لیتے اور منہ سے آواز تک نہیں نکالتے۔ جیسے کوئی مردہ قبر میں منکر نکیر سے ہڈیاں تڑوا رہا ہو۔

میں نے کہا......''یار...... یہ کوٹھا تو شہر کی مشہور گانے والی کا ہے۔ یہاں سے تو کبھی ایسا شور وغل یا ہنگامہ کبھی نہیں سنا۔ اس بازار میں کئی عزت دار کوٹھے ہیں۔ جن میں اس گانے والی کا یہ کوٹھا بھی ہے۔ یہاں آج یہ کیا نئی کرتوت ہوئی ہے؟ اس کا پتا لگانا چاہئے''۔

پان والے نے کہا......''تو پھر دیر کا ہے کی۔ بھیڑ چھٹ گئی ہے۔ شور وغل ختم ہو گیا ہے۔ آگے بڑھیں اور دل کا یہ تجسس دور کر لیں۔''

مجھے اس کی بات سے کچھ حوصلہ ہوا اور میں چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کوئی اکیس بائیس سیڑھیاں ہوں گی۔ جن میں موڑ کوئی نہ تھا۔ میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ گرنے والے کا جوڑ جوڑ ٹوٹ چکا ہوگا اور اس کا ملیدہ بن گیا ہوگا اور اگر زندہ بچ بھی گیا تو چھ مہینے تک بستر کے شکنجے میں جکڑا رہے گا۔ پائیدان کے ساتھ بوٹ رگڑتے ہوئے میں نے پوچھا......''میں اندر آسکتا ہوں؟'' دوہرے جسم کی ایک لمبی سانولی سلونی دوشیزہ جو زخمی شیرنی کی طرح لمبے ڈگ بھرتی اور زمین پر زور سے پاؤں مارتی کمرے میں پھر رہی تھی۔ یکدم رک گئی اور کہنے لگی......''نہیں آج نہیں پھر کبھی''......میں نے تپائی پر رکھے ہوئے جگ میں سے برف کا ٹھنڈا پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا''لیجئے تھوڑا سا ٹھنڈا پانی پی لیں۔ اس سے طبیعت کو سکون مل جائے گا۔ کیا ایک

انسان کی جان لے کر بھی آپ کے غصے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی؟" وہ دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر گرتے ہوئے کہنے لگی...... "کیا وہ مر گیا ہے؟" میں نے کہا "مرا تو نہیں۔ مگر میں نے اس کے ساتھیوں کو دیکھا ہے کہ اسے سہارا دے کر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا رہے تھے۔ اسے چوٹیں اتنی لگی ہیں کہ چھ مہینے تک چارپائی سے اٹھ نہیں سکے گا۔" کہنے لگی...... "مر بھی جاتا تو میں کہتی کہ دھرتی کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ اس جیسے کئی مردود شراب کے نشے میں دھت چکر کھا کر سیڑھیوں سے گرتے ہیں اور ہڈی پسلی تڑوا بیٹھتے ہیں"۔ میں نے کہا...... "ایسی باتیں تو روز دیکھتے ہیں۔ مگر آپ کے کوٹھے سے کسی شخص کا اس طرح گرنا بڑی اچنبھے کی بات ہے"۔ کہنے لگی۔ "ہاں میری سیڑھیوں سے کسی مہمان کا منہ کے بل گرنا اچنبھے کی بات ہے"۔ میں نے کہا "اس انوکھے واقعے کا سبب پوچھنے ہی میں آیا تھا"۔ وہ ٹھنڈا پانی پیتے ہوئے بولی۔ "نہیں آج نہیں۔ پھر کبھی آئیں۔ میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گی۔" میں اس سے وقت طے کر کے اپنے ڈیرے پر آ گیا۔

وقت مقررہ پر میں گیا۔ تو وہ مجھے الگ ایک کوٹھڑی میں لے گئی۔ مجھے چائے پلائی اور پھر اپنی کہانی کچھ اس طرح سنائی۔

اس شہر سے کوئی سو کوس دور ہمارا گھرانا ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ یہ گاؤں بہت بڑا تو نہیں تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ اس میں گانے بجانے والے دو چار گھروں کا گزارا نہ ہو سکے۔ ہم لوگ گانے بجانے کا دھندا کرتے تھے۔ ان دنوں کوئی بارات مجرے کے بغیر نہیں جاتی تھی۔ دلہن کی ڈولی آنگن میں آتے ہی مجرے کی محفل سجائی جاتی تھی۔ اس لئے میری ماں کو جو اس وقت کی مشہور گانے والی تھی دور دور سے بلاوا آتا تھا۔ انہی دنوں گاؤں کے نمبردار کا میری ماں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ نمبردار کا بوڑھا باپ زندہ تھا مگر اس نے نمبردار کے کاموں میں دخل دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ دخل دیتا بھی کیسے؟ وہ خود اپنے وقت کا بڑا شوقین اور عیش و عشرت کا دلدادہ رہ چکا تھا۔ ہوتے ہوتے چودھری اور میری ماں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ چودھری نے میری ماں کو یہ بھی کہا کہ وہ گناہوں بھری زندگی چھوڑ کے اس کی بیوی بن جائے۔ مگر میری ماں نے

یہ بات نہ مانی۔ دنیا جانتی ہے کہ پیار اور دشمنی ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہوتے۔ دونوں میں پیاز کے چھلکے جیسا پردہ ہوتا ہے۔ چند دن پہلے چودھری میری ماں کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ مگر اب وہ اس کی جان کا دشمن ہو گیا۔ سرکار دربار میں اس کی رسائی اور اس کے رعب دبدبے سے ڈرتے ہوئے ہمارے گھرانے نے گاؤں چھوڑ دیا اور ہم اس شہر میں آ چھپے۔ دلوں کا مالک ہی جانتا ہے کہ ان کے اندر کیا کچھ چھپا ہوتا ہے۔

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے

چودھری سمجھتا تھا کہ اسے میری ماں کے ساتھ محبت نہیں رہی۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ اسے اپنے دل کا خود بھی پتا نہیں تھا۔ اسی دل کے ہاتھوں تنگ آ کر وہ شہر آ گیا اور آ کر اس نے میری ماں کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ پرانی محبت پھر جاگ اٹھی۔ بیٹھنا اٹھنا شروع ہو گیا۔ میں بدنصیب اسی زمانے کی پیداوار ہوں۔ میری پیدائش پر چودھری نے چاندی کے ہزار روپے میری ماں کی جھولی میں ڈالے۔ اس کے بعد یہ پکی حویلی بنا کر دی۔ میرا بچپن چودھری کے لائے ہوئے کپڑوں، گہنوں اور کھلونوں میں گزرا۔ جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی چودھری اپنا زیادہ وقت ہمارے گھر رہنے لگا۔ اس نے کئی بار میری ماں سے کہا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جا کر رکھنے کی ہامی بھر لے مگر میری ماں نے اس کی یہ بات نہ مانی۔ وہ اس بات پر اڑی رہی کہ تم اس بچی کو دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہو۔ مگر میں اس پر سے ماں کا حق اٹھانے کو کبھی تیار نہیں ہوں گی۔ کیونکہ یہ طوائف کے کوٹھے پر پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے باپ کو باپ ہوتے ہوئے بھی باپ کا قانونی حق نہیں مل سکتا۔ میری ماں نے میرے لئے صاحب فن اور سمجھدار استاد نوکر رکھے۔ ان استادوں کی تربیت سے میں اپنی ماں کی طرح مشہور گانے والی بن گئی۔ اور سنگیت کلا کو سمجھنے والے دور دور سے میرے پاس آنے لگے۔

قدرت نے یہ عجیب ستم کیا کہ میں شکل صورت بات چیت اور رنگ روپ میں اپنے باپ سے مشابہ تھی۔ مجھے سینکڑوں میں کھڑے ہوئے دیکھ کر چودھری کو جاننے والا کوئی بھی شخص بلا جھجک

مجھے چودھری کی بیٹی کہہ دیتا تھا۔ جیسے جیسے میری شہرت دور دور تک پھیلی۔ چودھری سے ملتی جلتی میری شکل صورت کی بھی دھوم مچ گئی۔ ہوتے ہوتے یہ بات چودھری کے کانوں میں بھی پہنچی کہ جب مجھے چودھریوں کی باراتوں میں بلاتے ہیں تو چودھری اور اس کے باپ دادا کے دشمن ہنستے مسکراتے ہیں کہ اس بارات میں فلاں چودھری کی بیٹی کا مجرا ہوگا۔ چودھری ان باتوں کو سنتا تو اندر ہی اندر کڑھتا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس کا ڈیل ڈول اور قد کاٹھ آدھا بھی نہ رہا۔ میں بھی اسے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی اور کئی بار سوتے ہوئے میرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ چودھری نے میری ماں سے اپنا مطالبہ پھر دہرایا۔ میری ماں نے کہا۔ ''تم نرے احمق ہو۔ میری بیٹی نے تمہارے سماج میں نہ کھپنا ہے اور نہ خوش رہنا ہے''چودھری نے وقت کے بدلتے ہوئے رنگ۔ لوگوں کی نئی روش پر آگے بڑھتی سوچ کا واسطہ دیا۔ مگر میری ماں پر ان باتوں کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ آخر ایک دن چودھری دو تولے افیون کڑوے تیل کے ساتھ کھانے لگا تو میری ماں کو بروقت پتا چل گیا اور اس نے افیون کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دی اور رو رو کر چودھری سے اپنی جان نہ گنوانے کی قسم لے لی۔ چودھری کی ایک ہی شرط تھی کہ میری بیٹی کو میرے ساتھ بھیج دو۔ میری ماں نے مجبور ہو کر یہ شرط مان لی اور مجھے رخصت کر کے خود سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسی دن سے اس کی صحت گرنے لگی اور رفتہ رفتہ روگ اتنا بڑھا کہ کوئی دوا دارو کارگر نہ ہوا اور وہ چارپائی کے ساتھ لگ گئی۔

چودھری بڑے لاڈ اور چاؤ کے ساتھ مجھے لے کر گاؤں آیا اور وہاں مجھے الگ حویلی میں رکھا۔ میری خدمت کے لئے نوکر چاکر اور کام کرنے والی مائیاں اکٹھی کر دیں۔ گاؤں کی لڑکیاں بالیاں' بوڑھی عورتیں اور چودھرانیاں مجھے دیکھنے کے لئے بڑے ذوق شوق سے آئیں۔ ہاں چودھری کی اپنی چودھرانی اور اس کے بیٹے کی دلہن مجھ سے دور ہی رہیں۔ عورتوں کی بھیڑ میں یہ بات بار بار سنی جاتی تھی۔ ''اری دیکھ تو ...... یہ چودھری کی بیٹی کیسے نہیں؟ وہی ناک نقشہ' وہی رنگ ڈھنگ' وہی لمبا قد وہی کھلے ہاتھ پاؤں وہی شکل صورت۔ چودھری کی جیتی جاگتی صورت ہے۔ اس کا رنگ تو اس کے بھائی سے بھی زیادہ صاف ہے۔ ہو بہو چودھری کے رنگ کی طرح۔ جہاں

اتنی عورتیں اکٹھی ہوں وہاں گھر کی ساتویں کوٹھڑی میں کہی ہوئی بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ رفتہ رفتہ مجھے پتہ چل گیا کہ چودھری کا بیٹا میرے یہاں آنے پر بڑے غصے میں ہے۔ اس نے مجھے جان سے مار دینے کی قسم کھائی ہے۔ اس کی ماں اور نہیں تو اپنے شوہر کی خاطر ہی مجھے دیکھنے کے لئے ضرور آتی۔ لیکن بیٹے نے اسے ڈانٹا کہ اگر تو اس طوائف کو دیکھنے کے لئے گئی تو پھر کبھی اپنے بیٹے کا منہ نہ دیکھ سکے گی اور اگر تجھے میری زندگی میں موت آ گئی تو میں تجھے اپنے بزرگوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دوں گا۔ اور اگر چودھری نے برادری کے زور سے تجھے میرے دادے دادی کے پاس دفن کیا تو میں موقع ملتے ہی تیری ہڈیوں کو سؤر کی ہڈیوں کی طرح کھود کر باہر پھینک دوں گا۔ ماں کا دل یہ باتیں سن کر دہل گیا اور وہ سہمی ہوئی اپنے گھر میں چھپی رہی۔ مجھے کیا وہ کسی کو بھی نہیں ملتی تھی۔ چودھری کے ساتھ بھی اس کا کبھی کبھار میل ہوتا تھا۔ کیوں وہ ہمیشہ اس حویلی کی بیٹھک میں ڈیرا لگائے رکھتے تھے۔ جہاں میں رہتی تھی۔

چودھری کے بیٹے کی خوفناک باتیں سن سن کر میں اندر ہی اندر سہمی تو رہتی تھی مگر ایک چیز جو آج تک میری زندگی میں داخل نہیں ہوئی تھی اب چپ چاپ میرے دل میں گھر کرنے لگ گئی تھی۔ وہ چیز تھی بھائی کا پیار۔ وہ جب بھی ادھر سے گزرتا میں اسے دور سے دیکھ کر صدقے جاتی۔ میرا اس کا ناک نقشہ اتنا ملتا تھا کہ ہمیں کوئی اجنبی بھی دیکھ لیتا تو فوراً بہن بھائی کہہ دیتا۔ میں نمازیں پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگتی ''پاک پروردگار! میرے بھائی کے دل کو بدل دے۔ اگر اس کے دل میں میرا پیار جگہ نہیں بنا سکتا تو کم از کم اسے اتنی ہمت دے دے کہ وہ باپ کے خون کی خاطر اس بستی میں میرے وجود کو برداشت کر لے۔ بچوں کی تو دنیا ہی الگ ہے۔ اس کا چار پانچ سال کا بیٹا بھاگا بھاگا آتا۔ دادے کی گود سے نکل کر کہتا۔ مجھے پھوپھی کے پاس جانا ہے۔ دادا اسے گود میں اٹھا کر میرے پاس آتا تو میری روح کھل اٹھتی۔ اس کا منہ سر چومتی اسے کلیجے سے لگاتی۔ اس کے لئے مزیدار کھانے پکاتی اور اسے گود میں بٹھا کر کھلاتی اس کا بڑا بھائی تیسری چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ چھپ چھپ کر مجھے ملنے آتا۔ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتا۔ ''دیکھ لینا پھوپھی

ایک دن ابا تجھے منا کر لے جائے گا۔ تو ہماری پھوپھی ہے نا۔ ہم نے اپنی پھوپھی کو باہر نہیں نکالنا۔ پھوپی کی شادی اسی گاؤں میں کرنی ہے۔ میں نے اپنا پھوپھا بھی دیکھا ہوا ہے۔ میں یہ باتیں سن سن کر خوش بھی ہوتی اور حیرت میں بھی ڈوب جاتی۔ اس بچے کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ چودھری کی بیٹھک میں میری شادی کی بات چھڑی رہتی ہے۔ شادی کتنا پیارا لفظ ہے۔ مگر ہم بازار میں بیٹھنے والیوں کی زندگی سے یہ پاک لفظ اتنا ہی دور ہے جتنا کسی طوائف کے گھر سے زم زم کا چشمہ۔ میں سوچتی میری شادی کس کے ساتھ ہوگی؟ سوچتی سوچتی میں تاروں کی دنیا میں پہنچ جاتی۔ وہاں ایک چاندی جیسی پیشانی والا بڑا سا ستارہ چمکتا دمکتا دکھتی۔ اس تک پہنچنے کے لئے اڑتے اڑتے ہاتھ بڑھاتی۔ لیکن میں جتنا آگے بڑھتی وہ اتنا ہی دور ہو جاتا۔ مگر اس کی خنک روشنی سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملتا۔ میں سوتے جاگتے اپنے دن رات تاروں کی دنیا میں گزارتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی ایک جھٹکا ایسا لگتا کہ بادلوں کی بلندی سے زمین کی پستی میں جا گرتی۔ میں آپ کو ایک ایسے ہی جھٹکے کا حال سناتی ہوں۔

میرا بھائی کبھی کبھی حویلی کے آگے سے گزرتا تھا۔ اس کے لئے گھر سے کھیت کو جاتے ہوئے یہی راستہ نزدیک تھا۔ ورنہ وہ یہ راستہ ہی چھوڑ دیتا۔ ایک دن اس کا چھوٹا بیٹا مجھے مل کر حویلی کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ باپ نے دیکھ لیا اور پوچھا "کہاں سے آئے ہو؟ اگر وہ کہہ دیتا کہ دادے کے پاس سے آیا ہوں تو خیر ہوتی۔ مگر اس نے کہا "اپنی پھوپھی کے پاس سے آیا ہوں۔ میری پھوپھی بہت اچھی ہے۔" اتنا سننا تھا کہ بھائی صاحب غصے سے پاگل ہو گئے۔ مار مار کر بچے کو لہو لہان کر دیا۔ دادے نے چھڑانا چاہا۔ مگر بیٹے نے دھکا دے کر اسے بھی گرا دیا۔ گرتے ہوئے ان کی پگڑی گندی نالی میں جا پڑی۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہیں سر کے بل گر کر جان دے دوں۔ مجھ سے اپنے بوڑھے باپ کی بے عزتی نہیں دیکھی جاتی تھی۔ بھائی صاحب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "ساری عمر کنجر خانے میں گزاری ہے۔ اب گھر کو بھی کنجر خانہ بنا دیا ہے۔ بڑا آیا بیٹی کا باپ۔ زمین کی آمدنی سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اب گاؤں

میں بیٹی کی کمائی کھانے کے لئے رنڈی لے آیا ہے" باپ کھڑا کانپ رہا تھا۔ یہ بات سنتے ہی نیچے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ بھائی صاحب بیٹے کو گھسیٹتے ہوئے جا چکے تھے۔ اس خاندان کی تین پشتیں میرے یہاں آنے سے مصیبت میں پھنس گئیں تھیں۔ میں سوچتی تھی کہ کیا میرے باپ کا یہ خیال نرا جھوٹ ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو بازار سے اپنے بزرگوں کے گاؤں میں لا کر نیکی کی ہے۔ اگر نیکی یہی ہے تو اس کا ظاہری روپ بدی سے بھی زیادہ بدصورت ہے۔ گلی میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ عورتیں اور مرد، بچے اور بوڑھے اونچا اونچا بول رہے تھے۔ ان کی باتوں میں ایک بات مشترک تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار چودھری کو روتے اور گرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایسے ہی وقت لوگ پرانی باتیں یاد کرتے ہیں۔ وہ اس گاؤں کی مشہور لڑائی کا نام لے رہے تھے جب سو لاٹھیاں چودھری پر برسیں اور اس کا سر لہو لہان ہو گیا تھا۔ مگر اس نے ڈب میں سے پستول نکال کر اپنے تین دشمنوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس کے سر پر جتنے زخم تھے وہی عدالت میں اس کے صاف بری ہونے کا سبب بنے۔ کوئی کہتا چودھری اس وقت اتنا بوڑھا نہیں تھا۔ کوئی کہتا اب بھی وہ مرا نہیں۔ عمر کا بوڑھا ہے۔ مگر حوصلے کا جوان ہے۔ آج کی چوٹ اسے بیٹے کے ہاتھوں لگی ہے۔ وہ بھی جسم پر نہیں روح پر لگی ہے۔ کوئی کہتا چھوڑو یار ساری عمر وہ بوڑھی طوائف کے ساتھ منہ کالا کرتا رہا ہے۔ اب گناہ کے پھل کو بیٹی بنا کر یہاں لے آیا ہے۔ مسلمان بیٹا اتنا اندھیر کیسے سہہ سکتا ہے؟ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر چودھری کا اپنا حال تھا۔ میں نے نوکروں سے حویلی کا دروازہ بند کرا دیا۔ دیوان خانے میں سے سب لوگ نکلوا دیئے اور باپ کی خدمت کے لئے خود چوبارے سے اتر کر دیوان خانے آ گئی۔ وہ برسوں کا روگی لگتا تھا۔ پندرہ بیس دن بعد اس میں اتنی سکت آئی کہ وہ بیٹھک سے نکل کر حویلی کے صحن میں ٹہل سکے۔ مگر اس کا ہر دم ہائے ہائے کرنا اور آہیں بھرنا ختم نہ ہوا۔ بھوک جیسے پر لگا کر اڑ گئی تھی۔ مجھ سے اس کا یہ حال نہیں دیکھا جاتا تھا۔ وہ اب مجھ سے زیادہ باتیں بھی نہیں کرتا تھا۔

ایک دن جب اس کی طبیعت سنبھلی اس نے ساتھ کے گاؤں سے اپنے دوست مرزا

صاحب کو بلا بھیجا۔ مرزا صاحب پولیس میں ڈپٹی تھے اور اب پنشن لے کر اپنے گاؤں آ رہے تھے۔ ایک عزت دار سوچ سمجھ اور پہنچ والے آدمی تھے۔ چودھری صاحب نے ان کے کان میں کچھ باتیں کیں۔ وہ اپنے نوکر کو چھوڑ کر چپ چاپ باہر نکل گئے۔ شام کا وقت تھا۔ میں سمجھی نماز پڑھنے مسجد تک گئے ہیں۔ مگر وہ گھنٹے تک واپس آئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ اچھے لباس اور پوزیشن والا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیوان خانے میں چودھری صاحب کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا۔ آج وہ خوب بن ٹھن کر آیا تھا۔ جیسے بارات میں دولہا ہوتا ہے۔ میں چک کے پیچھے بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اور ایک ایک بات کو کانوں میں ڈال رہی تھی۔ پتہ چلا کہ یہ نوجوان چودھری صاحب کا سگا بھتیجا تھا۔ اس کے باپ کے مرنے کے بعد چودھری صاحب نے اسے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا اور اپنے باپ دادا کے نیک کاموں کا واسطہ دے کر سرکار سے اسے تحصیلداری کی نوکری دلوائی اور خود ہی مرزا صاحب کے آنے سے پہلے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ اچھی پوشاک پہن کر تیار رہے۔ اسے خاص کام کے لئے بلایا ہے۔ یہ سب باتیں اسی وقت میں نے چودھری کی زبان سے سنیں۔

میں سوچتی تھی کہ چودھری صاحب اس کے ساتھ کیا بات کریں گے؟ چودھری صاحب نے اب بات چھیڑی مگر جیسے کوئی ڈر ڈر کر بولتا ہے "بیٹے! میں نے اب تک تمہاری جتنی خدمت کی ہے آج میں تم سے اس کا صلہ چاہتا ہوں۔ اور امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ اور ابھی ...... اس لئے میں نے ڈپٹی صاحب کو بھی تکلیف دی ہے۔"

نوجوان کی آواز میں کرودھ چھپا تھا۔ کہنے لگا۔ مگر چچا! وہ تو طوائف کی اولاد ہے۔"

چودھری کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے تکیئے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! اپنے بوڑھے چچا کو اس سے زیادہ ذلیل نہ کرو۔ مجھ سے زیادہ تمہیں کون جانتا ہے؟ میں تمہارے برے بھلا کو بھی سمجھتا ہوں۔ میں تمہیں کوئی غلط کام کرنے کے لئے کبھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ میری بیٹی ہے۔ پڑھی لکھی سگھڑ سیانی، وہ پیاری کی پتلی ہے میں نے صرف اسی کی خاطر اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس کی ماں کے

کوٹھے پر گزارا ہے۔ ہمیشہ اس کی دیکھ بھال کی ہے۔ اپنی آنکھوں کے آگے اسے پالا پوسا ہے اسی دن کے لئے۔ دیکھو اور کان کھول کر سن لو۔ میں تمہارے سامنے ایک بات مردوں والی کرنے لگا ہوں۔ بڑی سے بڑی بااعتماد لیڈی ڈاکٹر سے اس کا معائنہ کرا لو۔ اگر تمہاری تسلی کے مطابق سرٹیفکیٹ مل جائے کہ میری بیٹی کو ابھی تک کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا۔ تو میری خاطر اس کی ماں کے رشتے کو بھول جاؤ اور چپ چاپ اس کے ساتھ نکاح پڑھا لو۔ تمہارا بوڑھا چچا تمہارے آگے اپنی زندگی کی آخری منت کرتا ہے۔ اس کے بعد تمہارے بوڑھے چچا نے کبھی کچھ نہیں کہنا۔ کبھی کوئی تکلیف نہیں دینی اور سنو میں اپنی آدھی جائیداد اس کام کے بدلے تیرے نام کرتا ہوں۔"

نوجوان اٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر کہنے لگا۔ میں ایک بڈھے کھوسٹ کے پاگل پن پر اپنی زندگی کی قربانی دینے کے لئے تیار نہیں۔ چودھری نے اپنی سفید پگڑی اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دی۔ یہ دیکھ کر ان کے پگڑی بدل بھائی مرزا صاحب کی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے دل کے درد کے ہاتھوں چیخ مار کر کہا ''او ظالم! خدا کے واسطے یہ تو سمجھ کہ تیرے قدموں میں آج اس مرد نے پگڑی اتار کر رکھی ہے جس کے لئے سر کٹوانا آسان ہے۔ مگر پگڑی کسی کے قدموں میں رکھنا مشکل ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تو اس کی بات مان لے۔ میں بھی تیری یہ نیکی ساری زندگی نہ بھولوں گا"۔ مگر وہ نوجوان پگڑی کو پاؤں میں رولتا ہوا باہر نکل گیا۔

اب چودھری گر گیا۔ کسی خمیرہ گاؤزبان، کسی مروارید کے نسخے اور کسی ٹیکے سے اس کے دل کو سہارا نہ مل سکا نہ ہی آنسو اس کی آنکھ سے خشک ہو سکے۔ وہ پارے کی طرح تڑپتا تھا۔ آہیں بھرتا تھا اور کہتا تھا او بڈھے! لعنت ہو تجھ پر۔ او بدنصیب! تیری چٹی پگڑی تیرے بیٹے نے موری میں گرا دی۔ تیرے دل کو تیر مارا۔ رہی سہی کسر بھتیجے نے نکال دی۔ تیری پگڑی کو پاؤں کے نیچے رولتا چلا گیا۔ ایک زخم بیٹے کے ہاتھوں لگا تھا۔ بھتیجے نے آخری چوٹ وہ لگائی ہے کہ تو مر گیا ہے۔ اب کیا انتظار کرنا۔ قبر میں کیوں نہیں چلا جاتا؟ اس رسوائے زمانہ چہرے پر مٹی کیوں نہیں پڑنے دیتا؟ تاکہ تیرا بدصورت چہرہ کوئی نہ دیکھ سکے۔

مرزا صاحب ایک پل کے لئے بھی اس کے سرہانے سے الگ نہیں ہوئے تھے۔ چودھری پندرہ بیس دن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دنیا کو چھوڑ کر اس دنیا میں چلا گیا جہاں کوئی کسی کو زخم نہیں لگا سکتا۔ جہاں کوئی کسی کے ارمانوں کا خون نہیں کر سکتا۔ جہاں کوئی کسی کی چنی پگڑی نہیں رول سکتا۔ اسے دفن کر کے اور اس کے قل کر کے مرزا صاحب اپنی موٹر لے کر آئے اور میرے باپ کی وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے موٹر میں بٹھا کر پھر یہیں چھوڑ گئے۔ میری ماں کی حویلی میں۔ جو میرے باپ نے میری ماں کے لئے بنائی تھی۔ تھوڑے دن ہوئے ایک بوڑھا سرکاری اہل کار یہ کہہ گیا تھا ہمارے تحصیلدار صاحب کو بڑا عہدہ ملا ہے۔ وہ افسر بن گئے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آ کر موج میلہ کریں گے اور راگ رنگ کی محفل سجائیں گے۔" میں نے پیسے طے کر کے وقت دے دیا۔

جب میں مہمانوں کے استقبال کے لئے دروازے پر گئی تو چودھری کا وہی بھتیجا کھڑا دانت نکال رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے زور سے لات ماری جس کا نتیجہ آپ نے دیکھ ہی لیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت دانت نکالنا اس کا آخری دانت نکالنا ثابت ہوا یا نہیں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ جس دغاباز نمک حرام کتے نے میرے بوڑھے باپ کا مان توڑا تھا اس کی گناہ گار بیٹی نے آخر اس پر اپنا غصہ نکال لیا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے اس کام پر جنت میں میرے باپ کی روح کو ضرور خوشی نصیب ہوئی ہوگی۔

آغا اشرف

راجو

راجو پیشہ ور بدمعاش نہیں تھا۔ ایک پیشہ ور بدمعاش بھگو بکھیاڑ کے ساتھ لڑائی نے اسے پیشہ ور بدمعاش بنا دیا۔ ہوا اس طرح کہ راجو سارا دن محنت مزدوری کر کے شام کے وقت اپنے ٹھور ٹھکانے جا رہا تھا۔ ایک جگہ بھگو نے اس کا راستہ روک لیا اور راجو کو چھری دکھا کر کہنے لگا "نکال.........کیا ہے تیرے پاس؟

راجو پیدائشی جی دار تھا۔ چھری کیا وہ بلموں سے بھی ڈرنے والا نہ تھا۔ اس نے بھگو کی کھال ادھیڑ دی۔ اسی چھری سے اسے چھلنی کر کے رکھ دیا۔ دونوں زخمی ہو گئے۔ بھگو ہسٹری شیٹر تھا۔ سماج دشمن خطرناک بدمعاش' آئی جی پولیس نے راجو کو اس کی جیداری کا انعام واکرام دے کر چھوڑ دیا اور بھگو پانچ سال کے لئے اندر ہو گیا۔ بستی میں بڑا نام ہو گیا راجو کا۔ بھگو نے شریفوں ہی کا نہیں بستی کے دوسرے بدمعاشوں کا بھی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ان سے بھی غنڈہ ٹیکس وصول کرتا تھا۔ بھگو قید ہو گیا تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ راجو کو زبردستی انہوں نے اپنا سردار بنا لیا۔ مگر وہ شریفوں کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ سمگروں اور بلیکیوں کی گردن ناپتا تھا۔ کیا مجال کسی غنڈے بدمعاش کی کہ اس کے علاقے میں کوئی واردات کرے۔ بڑا ابھکا ہو گیا تھا راجو کا۔ اور پھر یوں ہوا کہ راجو کو اپنے علاقے کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا۔ وہ کتابیں اٹھائے کالج آتے جاتے ہر روز راجو کے ڈیرے کے آگے سے گزرتی تھی اور راجو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اس علاقے کے ایک امیر آدمی کی بیٹی تھی۔ صابرہ تھا اس کا نام۔ وہ جب بھی گزرتی راجو چپ چاپ کھڑا اسے ٹکر ٹکر تکتا رہتا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا۔ اسے کوئی اشارہ بھی نہیں کرتا تھا وہ بہت شریف لڑکی تھی۔ مگر جو خود نیک نہ ہوں انہیں کسی کی شرافت کا کیا خیال؟ ایک نودولتیے باپ کا لوفر لڑکا صابرہ پر ریشہ خطمی ہو

گیا۔کئی بار اس نے اسے نوٹوں اور نئی کار کی جھلک بھی دکھائی۔مگر صابرہ نے اسے اپنی جوتی کی نوک پر بھی نہ رکھا اور لوفر لڑکے نے تنگ آ کر اسے اغوا کرنے کی کوشش کی۔

ایک دن صبح کو صابرہ کالج جانے کے لئے گھر سے نکلی اور ابھی وہ راجو کے ڈیرے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اتنے میں ایک کار اس کے پاس آ کر رکی۔لوفر لڑکا جلدی سے باہر نکلا اور صابرہ کا بازو پکڑ کر اسے کار کی طرف دھکیلنے لگا۔صابرہ کی چیخ نکل گئی۔آتے جاتے لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔مگر کسی کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

چیخ راجو نے بھی سنی تھی۔بھاگا آیا اور آتے ہی اس لوفر لڑکے کو اس نے ادھیڑ کر رکھ دیا۔اسے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔کار میں بیٹھ کر بھاگ گیا۔اس دن کے بعد جب بھی راجو اور صابرہ کا آمنا سامنا ہوتا صابرہ اسے سلام کر کے گزر جاتی۔راجو بھی بس اسے سلام کا جواب ہی دیتا اور کچھ بھی نہ کہتا۔مگر دل اس کا صابرہ کو کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔لیکن کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

آخر ایک دن راجو نے ہمت کر کے دل کی بات زبان پر لانے کی کوشش کی تو اسے خیال آیا کہ صابرہ امیر اور تو غریب ہے۔وہ پڑھی لکھی اور تو ان پڑھ ہے۔وہ شریف ہے اور تو بدمعاش ہے۔تیرا اس کا کیا جوڑ؟ راجو کی جیسے گھگی بندھ گئی۔کچھ بھی نہ کہہ سکا۔اور اس دن سے اس نے صابرہ کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔صابرہ کی ایک رئیس زادے کے ساتھ شادی ہو گئی اور ایک سال بعد وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔وقت گزرتا چلا گیا۔پانچ سال بیت گئے۔بھگو قید سے رہا ہو کر آ گیا اور بستی کی رکھ کو اپنی پناہ گاہ بنا کر وارداتیں کرنے لگا۔

ایک دن صابرہ کا بچہ حویلی سے باہر کھیل رہا تھا۔بھگو اسے اٹھا کر لے گیا۔بچے کے باپ نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔مگر کچھ پتہ نہ چلا کہ بچہ کہاں چلا گیا ہے؟ آخر تھک ہار کر بیٹھ گیا۔آنسوؤں اور آہوں نے اسے گھیر لیا۔اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔بچے کے باپ نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کانوں کے ساتھ لگا لیا کہ شاید کوئی خوشخبری ہو۔اور بات بھی ایسی ہی تھی۔دوسری طرف سے کسی نے اسے کہا......"شیخ صاحب! آپ کا بچہ میرے قبضے میں ہے۔اگر حاصل کرنا چاہیں تو کل

شام ایک لاکھ روپیہ لے کر رکھ میں پہنچ جائیے۔ورنہ آپ کے بچے کی خیر نہیں۔اور ہاں کان کھول کر سن لیں کہ اگر آپ پولیس کو لے کر آئے تو بدلے میں اپنے بچے کی لاش ہی لے جائیں گے۔"

بچے کی جدائی میں دھک دھک کرتے دلوں کو کچھ تو حوصلہ ہوا۔جگر کے ٹکڑے کی لاکھ روپیہ بھی تھوڑی قیمت تھی۔اللہ کا دیا سب کچھ تھا ان کے پاس۔ماں باپ دونوں ایک لاکھ روپے دے کر اپنا بچہ حاصل کرنے کے لئے تیار تھے۔دونوں کل آنے والی شام کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔بدمعاشوں کے بدمعاش ہی مخبر ہوتے ہیں۔راجو کو ایک بدمعاش نے بتایا کہ بھگو بکھیاڑ چڑے کے آڑھتی شیخوں کا بچہ اٹھا کر رکھ میں لے گیا ہے۔لاکھ روپیہ مانگتا ہے۔کل شام کی مہلت دی ہے۔راجو نے اس کی بات یوں سنی جیسے سنی ہی نہیں اور پستول ڈب میں سے نکال کر اس کی نالی صاف کرنے لگا۔

دوسرے دن شام کو صابرہ اور اس کا خاوند لاکھ روپیہ لے کر رکھ پہنچے۔چاند کی چودھویں رات تھی۔دونوں اپنے بچے کو دیکھنے کے شوق میں رکھ کے اندر چلے گئے۔اور ڈھونڈنے لگے کہ وہ ٹیلی فون کرنے والا گمنام آدمی کہاں ہے؟ ان کا بچہ کہاں ہے؟

اچانک ایک فائر ہوا۔وہ دونوں ڈر کر جہاں تھے وہیں کھڑے ہو گئے۔اس شام میں اوپر کی طرف فائر ہونے لگ گئے۔ایسے لگتا تھا جیسے آمنے سامنے گولیاں چل رہی ہیں۔اتنے میں بچے کے رونے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔اب نہ بچے کے رونے کی آواز آئی اور نہ فائر ہونے کی۔

صابرہ کی ممتا نے سمجھا کہ ظالم نے بچے کو مار دیا ہے۔بھاگ کر ادھر چلی گئی۔جہاں سے بچے کے رونے کی آواز آئی تھی۔آگے جا کر دیکھا تو بھگو ایک بوٹے کے پاس لہو میں بھیگا گرا پڑا تھا۔اس کے سامنے ایک بوٹے کے ساتھ ٹیک لگائے راجو خونم خون کھڑا تھا۔اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھی اور دوسرے ہاتھ میں بچہ۔اس نے آج بھی صابرہ سے کوئی بات نہ کی۔اس کا بچہ اسے دے دیا اور گرتا پڑتا ایک طرف چل دیا۔

"راجو......راجو......" صابرہ نے اپنے ہمدرد کو آوازیں دیں۔مگر اب بھی راجو کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔مڑ کر بجھی بجھی آنکھوں سے اس نے صابرہ کو دیکھا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

رفعت

بتی والا چوک

جب اس کے کانوں میں چاندی کی بالیاں کھلیں تو برکت جیسے ساری زندگی کے دکھ بھول گیا۔ زہرہ نازک سی نیک اور سیدھی سادی یتیم لڑکی تھی۔ اس کی بہن نے اپنے سر کا بوجھ اتار کر برکت کے سر پر رکھ دیا۔ مگر برکت کو یہ بوجھ پھول جیسا لگا۔ اتنی نازک' خوبصورت اور بے زبان لڑکی اس کی بیوی تھی۔ اس کی جھونپڑی اس کے آنگن کی رونق۔ گوٹے والا سرخ دوپٹہ اور پھولدار نائیلون کا سوٹ پہن کر زہرہ خود بھی نائیلون کی بنی ہوئی گڑیا نظر آتی اور باتیں کرتے ہوئے وہ اس کے کانوں میں چاندی کی نئی نویلی بالیاں ہلتیں اور بالیوں میں لگے ننھے منے پتھر اور پتھروں میں پروئے ہوئے سرخ موتی چمکتے تو اسے یوں لگتا جیسے زہرہ اس کی زندگی کی لال بتی ہے اور اس کے آگے اور کوئی عورت' کوئی لڑکی نہیں۔ ایسی لال بتی کے آگے عورتوں کی راہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایک منزل بن جاتی ہے۔

وہی برکت کی منزل تھی۔ برکت چمکتے دمکتے موتیوں کے اشاروں میں مگن ارد گرد کو بھول گیا۔ لیکن پانچ سال بعد برکت کو یوں لگا جیسے گھر کی رونق گھٹ گئی ہے اور اس کی کمر بھی ننگی ہے زہرہ کی چھاؤں میں زندگی نہیں اندھیرا ہے۔ گلی محلے والیوں نے بھی جب دیکھا کہ زہرہ ایک ایسا پیڑ ہے جس کی چھاؤں تو ہے مگر پھل نہیں تو انہوں نے بھی برکت کو مشورہ دینا شروع کر دیا۔ "بھیا! دیئے کی بتی ختم ہو جائے تو اندھیرے میں نہیں بیٹھتے دوسری بتی کا انتظام کرتے ہیں۔" برکت نے بھی سوچا کہ سڑک کی لال بتی خراب ہو جائے تو مسافر وہاں انتظار میں کھڑے نہیں رہتے۔ اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ بھلا میں ایسی خراب بتی کے آسرے پر کب تک یونہی بیٹھا رہوں اور ایک دن اس نے زہرہ کو اپنا فیصلہ سنا ہی دیا۔ "بھاگوان! ہم نے برادری سے ملنا جلنا ہے۔ ہم کب تک شادی بیاہ پر دوسرے لوگوں سے لین دین کرتے رہیں گے۔ کبھی کوئی ہم سے بھی لین دین کرے گا؟ نیک بخت! یہ سارا سلسلہ بغیر بال بچوں کے کیسے چلے گا؟ تو اگر اجازت دے تو میں دوسری شادی کر لوں؟

زہرہ انکار بھی کرتی تو پھر بھی دوسری بیوی برکت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ دوسری لے آیا۔ کہاں زہرہ راج کرتی تھی۔ اب اس کی ہستی کام کاج تک رہ گئی۔ پھر جب دوسری نے پانچ چھ سال میں ہی بچوں سے آنگن بھر دیا۔ تو اسے یہ بھی برداشت نہیں تھا کہ زہرہ اس کے بچوں کو پیار ہی کر لے۔ اسے یہ وہم رہتا تھا کہیں یہ سوتیلی بچوں کو کوئی برا بھلا تعویذ نہ ڈال دے۔ یا برکت کو مجھ سے چھین نہ لے۔ اس لئے روز روز کی مار کٹائی سے تنگ آ کر برکت اسے ایک دن داتا صاحب کے مزار پر لے آیا اور کہنے لگا۔ تیرا میکا تو کوئی ہے نہیں۔ میرے گھر میں بھی تیری کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے تو اس جگہ ڈیرہ لگا کر بیٹھ جا۔ میں کبھی کبھی آ کے مل جایا کروں گا۔ پہلے روز وہ اپنی گٹھڑی اپنی جھولی میں رکھ کر زنانہ مسافر خانے کے فرش پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھی اور بیٹھے بیٹھے سوگئی۔ اور یوں سوئی کہ اسے ہوش ہی نہ رہی کہ کہاں ہے؟ رات کے وقت اسے ایک عورت نے جگا کر کہا۔ "بہن! تو کب کی سوئی ہوئی ہے۔ لنگر تقسیم ہو رہا ہے۔ جا کے لے آ۔ لنگر کی تجھے ضرورت نہیں تو لے کر رکھ لے یہاں تو نیاز کے ایک ایک لقمے کے لئے لوگ منتیں کرتے ہیں۔ یہ بات سن کر وہ گٹھڑی کو بغل میں دبا کر لنگر لینے والی قطار میں جا کھڑی ہوئی۔ چنے کی دال اور نان...... اس نے ایک طرف بیٹھ کر کھا لیا۔ پھر ٹونٹی سے پانی پی کر فرش پہ آ کر لیٹ گئی۔ فجر کی نماز پڑھ کر عورتیں آٹھ آٹھ دس دس کی ٹولیوں میں بیٹھ گئیں۔ کچھ قرآن مجید کا درس سننے لگیں۔ کچھ وظیفے کرنے لگیں اور کچھ نے نعتیں شروع کر دیں۔ نعت سن کر وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگی۔ دنیا کے سب رشتے جھوٹے سچا رشتہ ایک...... میرا سوہنا پاک محمد ڈوبی بیڑی پار لگا۔ میرا دل صدقے...... میری جان صدقے...... دنیا کے سب رشتے جھوٹے...... رشتے جھوٹے...... جھوٹے...... زہرہ کو بیٹھے بیٹھے چکر آ گیا...... جھوٹے...... سب جھوٹے...... پر میں صدقے...... میں صدقے...... زہرہ نے نعرہ مار کر اپنی گٹھڑی پرے پھینکی اور کھڑی ہو کر دھمال ڈالنے لگی۔ اس

کے بال بکھر گئے۔ اس کا چکن کا تین گز کا دوپٹہ سر سے اتر کر پوری منڈلی پر سایہ بن کر چھا گیا۔ اور اس کے کانوں میں چاندی کی میلی کالی بالیاں زور زور سے ہلنے لگیں...... صدقے...... صدقے...... میری جان صدقے...... میرا دل صدقے...... دنیا کے سب رشتے جھوٹے...... ارے جھوٹے...... عورتوں کی آواز اونچی ہو گئی اور وہ جھوم جھوم کر نعرے مارتی رہی...... میں صدقے...... "بڑی معرفت والی عورت ہے...... کسی بڑے پیر فقیر کی نظر ہے اس پر...... حاجی جی! اب بس کرو...... بیٹھ جاؤ۔ عورتوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر نیچے بیٹھ جانے کو کہا۔ مگر وہ جھومتی رہی۔ جھوٹے رشتے...... میں صدقے...... جھومتے جھومتے وہ یکدم گری اور میلے کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح ایک ہی جگہ ڈھیر ہو گئی۔ عورتوں نے اس کے حصے کے پیسے نیاز کھیر اور چاول اس کے چکن کے دوپٹے میں لپیٹ کر رکھ دیئے۔ مگر اسے تو دوپہر تک ہوش نہ آیا۔ پانچ چھ دن گزر گئے اور ملتان سے آئی ایک ملنگنی بختو نے اسے کہا "میری بات مان...... یہاں کسی کو نہ بتانا کہ تیرا خاوند تجھے یہاں اس لئے چھوڑ گیا ہے کہ تو بے اولاد تھی۔ تو نہیں جانتی کہ تو کتنی اچھی دھمال ڈال لیتی ہے۔ تجھ پر عورتیں نوٹوں کا مینہ برسا دیتی ہیں۔ آ تو مجھ سے شراکت کر لے۔ میں داتا کی قسم کھا کر کہتی ہوں میں تیرے بے وفا خاوند کی طرح تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ میں یہاں جو سب کو یہ کہانی سناتی ہوں کہ میں سوہنے شکر گنج کے مزار سے یہاں اپنی منزل پوری کرنے آئی ہوں تو یہ سب جھوٹ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا خاوند میرے بھائی کے قتل کے جرم میں پھانسی لگ گیا تھا۔ میرا ٹھکانہ نہ سسرال میں رہا نہ میکے میں۔ وہ دونوں ایک عورت کے لئے لڑ پڑے تھے۔ میرا بھائی جوان تھا وہ عورت کو لے کر نکل گیا اور میرے خاوند نے موقع دیکھ کر دونوں کو قتل کر دیا۔ میرے باپ اور دشمنوں نے مقدمہ لڑا۔ مربع زمین کا بھی بک گیا۔ اور میرے گھر والا بھی پھانسی لگ گیا۔ میں کالے کپڑے پہن کر چپ چاپ گاؤں سے نکل آئی اور آ کر یہاں بیٹھ گئی۔" "تو میری بات مان...... ہاتھوں میں پائلی اور داتا کے نام کے کڑے پہن لے اور موٹے موٹے نگینوں والی انگوٹھیاں یہ لے میرے پاس دو کڑے اور تین چار انگوٹھیاں پڑی ہیں۔ تو پہن لے اور چل

نیچے۔ وہاں سے جا کر گلے میں پہننے کے لئے منکوں کی مالا۔ رنگین تسبیحیں اور ہار لے آتے ہیں۔ تو صرف بیٹھ جا یہ چیزیں پہن کر اور عورتوں کو میں تیرے پاس لے کر آؤں گی دعا کرانے کے لئے۔ کسی کو اپنے پلے سے یہ پیسے بھی دے دیا کرنا جب وہ اپنے کاروبار کے لئے دعا کرانے آئے اور کہنا یہ داتا کا پیسہ ہے۔ برکت والا۔ جا اپنے پرس میں رکھ لے۔ پھر دیکھنا کیسی لہر بحر لگتی ہے۔ ہمیں پھر کسی کی پروا نہیں رہے گی۔ بہت ہوا تو ہم یہاں سے نکل کہیں کسی گلی میں اپنا ڈیرہ بنا کر بیٹھ جائیں گے...... آ...... آج سے میں اور تو دونوں دوست ہیں...... ان دونوں نے مزار سے ملی ہوئی نائیلون کی سنہری چزیاں اپنے اپنے سر سے اتار کر ایک دوسرے کے سر پر رکھ دیں۔ اب وہ ایک دوسری کی دوست اور پیر بہنیں بن گئیں تھیں۔ کچھ دن بعد زہرہ نے چادریں جوڑ کر ایک کھلا سا جھولا سی لیا۔ نائیلون کا ہرے رنگ کا جھولا اوپر ہرا دوپٹہ پگڑی کی طرح باندھ لیا۔ چاندی کی میلی بالیوں میں موتیئے کے پھول پرو ڈالے جن کے نیچے لال موتی چھپ گئے۔ یوں بھی اب یہ موتی لال نہیں رہے تھے۔ میلے میلے ہو کر مٹیالے ہو گئے تھے۔ یہ ستارے کرتی لال بتیاں نہیں رہے تھے جو برکت کی منزل تھی۔ اب تو زہرہ ایک نئے چوراہے پر آن کھڑی تھی...... وہ دھمال ڈالتی تو عورتیں نوٹوں اور پیسوں کی بارش کر دیتیں۔ پھر عورتیں اس کے پاس دعا کرانے کے لئے آنے لگیں۔ ملتان والی ملنگنی بختو دو چار عورتیں گھیر گھار کر لے آتی۔ "تمہاری تو قسمت اچھی ہے...... یہ بہت پہنچی ہوئی عورت ہے۔ کسی کسی پر نظر کرتی ہے......" پھر وہ بے اولاد عورتوں کو اس کے ہاروں میں سے منکے اور کانوں کی بالیوں میں سے پروئے ہوئے پھول توڑ کر دیتی اور کہتی...... "بابا کہتا ہے...... داتا جھولی بھرے گا...... داتا خیر کرے گا......" اور وہ حق اللہ کا نعرہ مارتی اور کہتی "میں داتا کی کتیا رکھ لے لاج مری" ...... اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور ملنگنی بختو جلدی سے کہتی اتنا کیوں روتے ہیں بابا جی...... کیا کوئی بڑی شے دیکھی ہے؟ دل لگا کر دعا کرو بیچاری کے لئے...... آنے والی عورت پر بہت اثر ہوتا اور وہ رومال میں بندھے پیسوں میں سے بڑا حصہ ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی۔ سب سے مشکل گھڑی وہ ہوتی جب کوئی عورت اپنا منا سا بچہ لا کر اس کی

جھولی میں ڈال دیتی۔ سائیں جی! یہ آپ کی دعا ہے۔ آپ نے مجھے اپنی بالی کا پھول دیا تھا''...... زہرہ اس بچے کو جھولی میں سے اٹھا چھاتی سے لگا لیتی اور اسے یوں دیکھتی جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔ پھر اپنے مصلے پر رکھے بتاشوں پر انگلی لگا کر بچے کے ہونٹوں پر لگاتی۔ بچہ میٹھا چوستا اور وہ ہنس پڑتی۔ ''حاجی جی! آپ اللہ کے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ہمارے لئے بھی دعا کریں''...... کوئی اور عورت کہتی...... ''بزرگو! ادھر نظر کرم''...... ''میرے گھر رب نے دس سال بعد بچہ دیا ہے ان کی دعا سے...... ہمارا کاروبار ٹھیک ہو گیا ہے''...... ''میرا خاوند بیمار تھا اب تندرست ہو گیا ہے''

......وہ سب کی باتیں خوشی اپنی بڑائی سن کر اسے بھول پڑنے لگتے۔ بختو دیکھ لیتی کہ اب بابا جی پھر اپنے برکت کی یاد میں کھو گئے ہیں تو وہ جلدی سے بازار سے شیشے کے گلاس میں چائے لے آتی۔ ''پیو بابا جی! آپ نے لوگوں کے غم میں اپنا آپ گنوا لیا ہے۔ لو گرم گرم گھونٹ بھرو''...... بختو اسے چائے کے دھیان لگا کر خود اس کی بالیوں میں سے پھول اور باروں کے منکے عورتوں کو دینے لگ جاتی اور کہتی...... ''آج بابا جی ساری رات خدا کے ساتھ باتیں کرتے رہے ہیں۔ آنکھیں دیکھی ہیں لال؟'' پھر اس منڈلی میں سے زہرہ کو اٹھا کر ایک طرف لے جاتی۔ مسافر خانے کے آخری زینے پر جا کر زہرہ اونچی اونچی بولنے لگتی...... ''بیٹا دے دیتا تو کیا تھا؟ ہماری باری ہاتھ اٹھا لیا۔ یہ یاری تو نہیں'' تو بختو اسے جھنجھوڑ کر کہتی ''بابا جی! اپنی بختو کی طرف تو دیکھو آج بختو کو بھی بھول گئے ہو'' پھر بختو گانے لگ جاتی...... ''اوئے...... میں تج کے یار منانا...... میں داتا دی گلی...... داتا خیر دیو......'' اور اس کے ساتھ ہی جیسے زہرہ کو کچھ یاد آ جاتا ...... وہ اپنے سر پر پگڑی پھر باندھ لیتی اور جھومنے لگ جاتی۔ اسے ایسے لگتا جیسے وہ تو خود ہی برکت ہے۔ وہ اشارے کرتی چورا ہے میں گئی وہ بتی ہے جس نے یہاں آئے ہوئے تمام مسافروں کو نئی نئی راہیں دکھائی ہیں۔ وہ زہرہ نہیں۔ وہ برکت بھی نہیں۔ وہ بابا بھی نہیں۔ وہ تو بتی والا چوک ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے اور عورتیں اس کی جھولی میں سے آنسوؤں میں بھیگے پھول اور بتاشے چھین کر لیتیں نیاز سمجھ کر تبرک جان کر مگر زہرہ جانتی ہے کہ یہ تو بتی والے چوک کے اشارے ہیں۔ نرے اشارے۔

حنیف چودھری

اندھا شیشہ

خورشید جب ہمارے کالج میں داخل ہوا تو کلاس کے لڑکے لڑکیوں نے اس کا کچھ ایسا استقبال کیا کہ وہ روہانسا ہو کر رہ گیا۔ کوئی اسے بھوت کہتا۔ کسی نے حبشی کا لقب دیا۔ کوئی ریچھ کہہ کر پکارتا اور کوئی مائٹ انگیل بات یہ تھی کہ خورشید کا رنگ کالا سیاہ تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھنے والے کو ایسے لگتیں جیسے تختہ سیاہ پر چاک کے دو نقطے ہوں۔ ناک چپٹا' چھوٹا قد جسم پر بڑے بڑے کالے بال دیکھنے والے اس کی شکل سے نفرت کرتے اور کلاس کے لڑکے لڑکیوں نے اس کا بیٹھنا محال کر دیا۔ گھنٹی بجنے پر جب پروفیسر لیکچر دینے کمرے میں آیا تو آتے ہی اس کی نظر خورشید پر پڑی۔ اس نے عینک لگا کر دیکھا تو اپنی کرسی کے نزدیک جا کر خورشید کی طرف اشارہ کر کے کہا ''تم کب داخل ہوئے بھئی؟''

خورشید جواب کے لئے اٹھا ہی تھا کہ پیچھے کوئی لڑکا ''کھی'' کر کے ہنس پڑا اور ساتھ ہی ساری کلاس کے لڑکے لڑکیاں کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ پروفیسر نے پھر کہا۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''خورشید جناب''

پیچھے سے ایک لڑکے نے طنز کیا ''واقعی چاند کا ٹکڑا ہے''۔

وہ ساری کلاس بلکہ سارے کالج کے ہنسی مذاق اور طنز کا نشانہ بنتا رہا۔ اس نے ان ساری باتوں کو ذرا بھی محسوس نہ کیا۔ محنت لگن اور شوق سے کام کرتا رہا۔ سارے کالج نے اس کے نام کے ساتھ ''ریچھ'' کی چڑ ڈال دی۔ لڑکے لڑکیاں منہ پر بھی ریچھ کہتے۔ مگر وہ ہنس کر ہی جواب دیتا۔ وہ بہت لاپروا تھا۔ کبھی وقت پر کالج نہ آتا۔ کالج کا کام نہ کرتا۔ سب سے پیچھے بیٹھتا اور بہت ہی کم

بات چیت کرتا۔ وہ باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ ریٹائرڈ تحصیلدار تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ جائیداد بے شمار تھی۔ رشوت کے مال سے بنائے ہوئے بہت سے مکان تھے۔ خورشید تو پڑھنا نہیں چاہتا تھا مگر باپ پڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے اسے لاہور پڑھنے بھیجا۔ لیکن وہاں غلط راستے پر چل نکلا۔ پھر یہاں کالج میں داخل کروایا۔ یہاں لاپروائی سے کام کرتا۔ کالج کے پروفیسروں نے کئی بار جرمانے کئے۔ سزا دی مگر وہ اپنی ڈگر پہ قائم رہا۔ کالج سے اس لئے نہ نکالا گیا کہ وہ بااثر آدمی کا بیٹا تھا۔

ایک دن کالج میں پریکٹیکل کرتے کرتے دیر ہوگئی میں بس سٹاپ پر اکیلی کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی کہ اتنے میں وہ ریچھ بھی آن کھڑا ہوا۔ پہلے تو چپ چاپ کھڑا میری طرف دیکھتا رہا پھر میرے بہت قریب آ گیا۔ میں ڈر گئی وہ مجھ سے پوچھنے لگا "کیا وقت ہے آپ کے پاس؟" جواب دینے سے پہلے میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی مجھے اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھ تو نہیں رہا؟ کالج کے اندر کلاس فیلوز کے لڑکیوں سے بات کرنا کچھ اور ہوتا ہے۔ مگر بس سٹاپ یا سڑک پر کھڑے ہو کر بات چیت کرنے کا مطلب کچھ اور لیا جاتا ہے۔ میں نے ذرا سا پیچھے ہٹ کر جواب دیا "ڈھائی بجے ہیں" وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھ آیا۔ آپ نے کون سے سٹاپ پر اترنا ہے؟ یہ سوال سن کر میں اور بھی ڈر گئی کہ یہ بدمعاش میرا پیچھا کرنا چاہتا ہے اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں کئی خیال گھومنے لگے۔ مجھے اس وقت اور تو کچھ نہ سوجھا اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اگلے سٹاپ کی طرف چل پڑی۔ جو موڑ سے آگے کوئی ایک فرلانگ پر تھا جہاں ہر وقت مسافر کھڑے رہتے تھے۔ میں ابھی آدھا فرلانگ ہی گئی ہوں گی کہ دو لوفر لڑکوں نے کار میں سے اتر کے مجھ اکیلی کو گھیر لیا۔ ایک نے کہا "سرکار! کتابوں کی جگہ ہمیں سینے سے لگا لو"۔ دوسرے نے آگے بڑھ کے میری کلائی پکڑنے کی کوشش کی۔ تاکہ مجھے اٹھا کر موٹر میں ڈال لے۔ میں بھاگ کھڑی ہوئی میرا دوپٹہ سر سے اتر گیا۔ کتاب بھی گر پڑی۔ مگر میں کسی بھی شے کی پروا کئے بغیر آگے بھاگتی رہی۔ میرا حلق اتنا سوکھ گیا کہ مجھ سے بولا نہ جاتا تھا۔ میں کوئی بیس قدم بھاگی ہوں گی کہ دیکھا اس "ریچھ"

نے ایک لوفر کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اتنے میں بس آ گئی اور میں بھاگ کر بس پر چڑھ گئی۔

بس میں بیٹھ کر میں نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پایا اور سوچنے لگی کہ اگر "ریچھ" نہ آتا تو پھر نجانے میرے ساتھ کیا گزرتی۔ وہ مجھے کہاں لے جاتے؟ میرے ساتھ کیا کرتے؟ آج پہلی بار خورشید کے بارے میں میرے دل میں احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کی بدصورتی اور کردار میں بہت بڑا فرق نظر آیا۔

اس واقعے کے بعد وہ سات دن تک کالج نہ آیا۔ آٹھویں دن بارہ بجے میرا پیریڈ خالی تھا۔ میں لان میں کنیر کے بوٹے کے نیچے بیٹھی تھی کہ اچانک خورشید میرے سامنے آ کھڑا ہوا میں اس کے احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتی تھی مگر اپنے محسن کے احترام میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کتاب اور دوپٹہ دیتے ہوئے کہا۔ اس دن یہ کتاب اور دوپٹہ وہاں گر گئے تھے تو میں اٹھا لایا۔ "شکریہ" اس سے زیادہ میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ وہ دو قدم آگے جا کر پھر واپس مڑا اور نظریں جھکا کر کہنے لگا۔ میں پانچ سات دن کالج نہیں آیا۔ سنا ہے کہ میرے بعد بہت اہم نوٹس لکھوائے گئے ہیں مجھے وہ نوٹس دے دیں میں نقل کر کے لوٹا دوں گا" "میں کل لیتی آؤں گی۔" "اچھا...... شکریہ" دوسرے دن وہ کالج نہ آیا۔ تیسرے دن جب وہ مجھے کالج میں ملا تو اس نے سفید رنگ کا ٹھنڈا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر کے بال تیل سے چمک رہے تھے۔ کالی آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا تھا۔ کپڑوں سے خوشبو آ رہی تھی۔ جب وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہوا تو میرے کلاس فیلوز کے لڑکیاں ایک دوسرے کو کھنکارتے ہوئے مجھے بٹر بٹر دیکھ رہے تھے۔ میں گھبرا گئی کہ یہ میرے ساتھ بات کرے گا تو میں سب کے سامنے کیا جواب دوں گی۔ اس نے پوچھا نوٹس لے آئی ہو؟ میں نے دل پکڑ کر کے کہا "جی"

"چلو کنٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں تم چائے پیا میں نقل کر لوں گا۔" یہ سن کر معلوم نہیں میں کیوں اس کے آگے آگے چل پڑی۔ لیکن وہ میرے پیچھے پیچھے آنے کی بجائے کالج کے اوپر سے چکر لگا کر کنٹین میں آیا۔ جیسے میری بدنامی کے احساس سے واقف ہو۔ اس کے آنے سے پہلے

میں چائے کا آرڈر دے چکی تھی۔ مگر خورشید نے کھانے کے لئے بہت ساری چیزیں منگوالیں۔ وہ نوٹس لکھنے کی بجائے میرے پاس بیٹھ کر چائے پینے لگ گیا۔ وہ باتیں کرتا جارہا تھا۔ سماج کی باتیں' معاشرے کی ناانصافی کی باتیں۔ ادب اور شاعری کی باتیں۔ اور بہت سی باتیں۔ کالج کے لڑکوں کی باتیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ مجھے اس بات کی حیرانی ہے کہ مجھے حیوان کہنے والے مجھے ریچھ پکارنے والے خود کتنے حیوان ہیں۔ بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر۔ استادلڑکیوں کو بیٹیاں کہتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کو سب کے سامنے بہنیں کہتے ہیں مگر دیکھتے بری نظروں سے ہیں۔ وہ انسان ہیں؟ اس کا نام انسانیت ہے؟ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے؟

اس طرح موضوع بدلتے رہے...... میں ہنکارا بھرتی رہی...... یہ باتیں سن کر میرے دل میں اس کا احترام اور بھی بڑھ گیا اور اس کے بارے میں میرے خیالات کا انداز بھی بدل گیا۔ وہ جاتے ہوئے مجھ سے نوٹس بھی لے گیا۔ گھر آتے ہوئے راستے میں میرے ذہن میں عجیب عجیب خیال آنے لگے۔ میں اس میں دلچسپی کیوں لے رہی ہوں؟ مجھے اس کی باتوں پر اعتبار کیوں آرہا ہے؟ وہ بدصورت ہے۔ کوئی بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتا۔ میں ایک لڑکی ہوتے ہوئے اس کی طرف کیوں بڑھتی جارہی ہوں؟ میں نے اپنے دل میں اس کی بدصورتی سے نفرت کا جذبہ ابھارنے کی کوشش کی مگر شیلے کی سکائی لارک کی طرح میرے خیالات اس کی پاکیزگی میں گم ہوتے گئے۔ میرے ذہن میں اس کی بدصورتی اس کے پاکیزہ خیالات اور بلند کرداری کے تیزاب سے دھلتی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دل میں اس کے احترام کا جذبہ محبت میں بدلتا جارہا ہے۔ محبت تو خوبصورت چیز ہوتی ہے میں نے دل سے پوچھا کیا وہ خوبصورت ہے؟ میں اپنی محبت کی تکمیل شادی کرکے کروں گی۔ شادی بھی تو دوروحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ میں ساری رات سو نہ سکی۔ میرے خیالوں کی راہ میں خورشید کے قدموں کی آہٹ آتی رہی۔ رات کے اندھیرے میں وہ ایک فرشتے کی طرح میری آنکھوں کے آگے گھومتا رہا۔ میں خیالوں کی دنیا میں دور نکل گئی۔ کبھی سوچتی کہ میرے ماں باپ اس رشتے کے لئے راضی ہو جائیں گے؟ لوگ میری

اس پسند کا مذاق تو نہیں اڑائیں گے؟ کبھی خیال آتا محبت ان سوچوں کی پروا نہیں کرتی۔ صبح جب میں دیر سے اٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارے خاندان کو میرے اس ارادے کا پتہ چل گیا ہو۔ سب لوگ جیسے مجھے شک سے دیکھ رہے ہوں۔ کالج میں بھی ایسے ہی ہوا۔ میں گھبرا کے کالج سے گھر آ گئی۔ اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوچنے لگی۔

دن گزرتے گئے۔ میری سوچیں ختم ہو گئیں۔ میرے دل سے کلاس فیلو لڑکے لڑکیوں کا مذاق اور لوگوں کے طعنوں کا ڈر جاتا رہا۔ ہم دونوں کالج کی کنٹین میں لائبریری کے ریڈنگ روم میں کافی دیر بیٹھے رہتے۔ اب خورشید مجھ سے اپنی نجی زندگی کے بارے میں بھی مشورے لیتا۔ ''شمیم! یہ سوٹ مجھے اچھا لگتا ہے؟ ......مرے ابا جی مری جا رہے ہیں۔ مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں جاؤں؟ ......اس سال کا داخلہ بھجوا دوں یا نہ۔ کیونکہ میری تیاری مکمل نہیں۔'' جیسے سارے کالج میں میں ہی اس کی ہمدرد ہوں۔ میں خوش تھی کہ مجھے میری منزل مل گئی ہے۔ مگر مجھے ایک پریشانی نے گھیر لیا۔ کہ خورشید کیوں نہیں اپنی محبت کا اظہار کرتا؟ میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ میں اس کی منزل ہوں۔ اس کی پجارن ہوں۔ اس نے شاید احساس کمتری کے باعث اس بات کی پہل نہیں کی۔ میں کئی بار بات چیت اس موڑ پر لاتی۔ مگر وہ چپ ہی رہا۔ امتحان سر پر آ گیا۔ میری نظریں کتاب پر ہوتیں اور دماغ خورشید کے گرد گھومتا رہتا۔ خورشید کھل کر بات کیوں نہیں کرتا؟ میں اس بارے میں اسے خط لکھوں...... پیغام بھیجوں...... کیا کروں؟

دن رات کے قافلے کے پیچھے بھاگتا رہا...... میں سوچوں میں ڈوبی رہی۔ ان سوچوں نے مجھے فیل کرا دیا۔ خورشید پاس ہو گیا۔ میری ناکامی میں میری محبت کا ہاتھ تھا۔ لیکن کالج کے امتحان کی ناکامی زندگی کے امتحان کی کامیابی کا ثبوت تھی۔ جس دن رزلٹ آیا تھا۔ میں نے خورشید کو کالج میں نہ دیکھا۔ شاید کہیں باہر چلا گیا تھا یا بیمار تھا مجھے اپنے فیل ہونے کا غم تو نہیں۔ افسوس یہ تھا کہ خورشید ایک کلاس آگے چلا گیا۔ میرے ساتھ کیوں نہ رہا؟ ......ایک ہفتہ گزر گیا نہ وہ خود آیا اور نہ کوئی خبر دی۔ میری تشویش بڑھ گئی دوسرے دن جب میں کالج سے گھر آئی تو نوکر

نے مجھے خورشید کا رقعہ دیا۔ رقعہ لفافے میں بند تھا۔ میں خوشی سے ناچ اٹھی۔ نوکر چلا گیا تو میں نے جلدی جلدی خط کھولا۔ پڑھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر برف گر پڑی ہو...... میں زمین پر گڑتی جا رہی ہوں۔ لکھا تھا۔

"پیاری بہن!

تمہارے فیل ہونے کا مجھے اتنا دکھ ہوا کہ افسوس کے لئے لفظ نہیں ملتے کاش اپنی بہن کی جگہ میں فیل ہو گیا ہوتا۔ بہنوں کی خوشی بھائیوں کا مان ہوتی ہے۔ میرا مان ٹوٹ گیا۔ میں افسوس کے لئے اس لئے نہ آسکا کہ اچانک میری شادی طے ہو گئی۔ میں مصروف ہو گیا۔ میرا یہ خط دعوت نامہ ہے۔ ضرور آنا۔"

یہ پڑھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ شرمندگی سے میں پانی پانی ہو گئی۔ میرے جذبات نے میرے ضمیر کا شیشہ اندھا کیوں کر دیا تھا۔؟ جس میں خورشید کے اندر چھپے ہوئے انسان کو میں نہ دیکھ سکی۔

اقبال خالد

لمبی راہیں

"...... کیمپ والے ہماری ڈال روک لیتے ہیں"۔

میں یہ سن کر ہنس پڑا اور وہ چڑ کر بولا...... سر کمال ہے آپ میری بات کا یقین نہیں کرتے۔ سر چھ مہینے ہو گئے ہیں اور شانی کا خط ہی نہیں آیا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس نے خط نہ لکھا ہو۔ ادھر والے ہی گھپلا کرتے ہیں۔"

جس روز ڈاک تقسیم ہوتی لیفٹیننٹ اختر میرے پاس آ کر اس طرح کی باتیں کرتا تھا۔ اس طرح ہمارے کیمپ میں رونق اس کے دم سے تھی۔ ہر کسی سے چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق اس کا ہر وقت کا کام تھا۔ مگر جس روز ڈاک تقسیم ہوتی اس روز وہ اداس پھرتا اور چپ چاپ رہتا۔ آج بھی جب "جنٹلمین!۔ لیٹرز" کی آواز آئی تو وہ اپنا بنایا ہوا پنجرہ چھوڑ کر بھاگا اور کچھ دیر بعد مایوس اور نامراد واپس آ گیا۔ اس نے پنجرے کے دونوں پرندے آزاد کئے اور نظریں نیچے کئے دوسری طرف چل دیا۔

میں اس کیمپ میں سب سے پہلے آیا تھا۔ اور کچھ دیر اکیلا ہی رہا۔ ہر وقت دعائیں مانگتا تھا۔ الٰہی آزادی دے یا کوئی سنگی ساتھی دے دے۔ دعا کا یہ دوسرا حصہ قبول ہوا اور بہت سے قیدی کیمپ میں آ گئے۔ رنگ برنگے انسان۔ کوئی محفل ساز اور کوئی اپنی ذات میں ہی محفل، ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا کہ ایسے منفرد اور رنگ برنگے ساتھی سے یہ خوبصورت محبت قید میں ہی کیوں نصیب ہوئی؟ لیفٹیننٹ اختر کی شخصیت ہشت پہلو ہی نہیں سدا بہار بھی تھی۔ سب سے کم عمر سب سے جونیئر بڑا شوخ ملنسار اور ذہین۔ وہ رنگی جوکس سے لے کر سکھوں اور پٹھانوں کے لطیفے سناتا۔ سلطان باہو سے کیٹس اور حافظ تک کے شعر سناتا اور عالم لوہار سے سہگل تک سب

کی نقلیں اتار کر ہم کو سناتا پھر پنجرے اور پتنگیں بنانے کا ماہر۔ اس کے ساتھ رہ کر قید کاٹنا کوئی مشکل نہیں لگتا تھا۔

ویسے تو وہ سب کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ لیکن میرے کچھ زیادہ ہی قریب آ گیا تھا۔ ایک تو میں اس کیمپ کا پہلا اور اکیلا قیدی رہا تھا اور ہر کسی کو اس بارے میں تجسس تھا۔ لیکن ہمارا قرب ہم ذوق ہونے کے سبب تھا۔ ابن انشا سے اختری بائی فیض آبادی تک ہماری پسند ایک تھی۔ اپنی منگیتر کو خط لکھتے وقت وہ میرے ساتھ شعروں کے بارے میں بحث اور مشورہ کرتا رہتا۔ ایک دن میں نے کہا "یونہی پریشان نہ ہوا کر۔ خط آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر ہو سکتا ہے اسے عادت ہی نہ ہو خط لکھنے کی۔"

"سر بہت فرق پڑتا ہے...... ذرا مورال اونچا رہتا ہے۔ رہی بات عادت کی تو اکیڈمی روزانہ خط آتا تھا۔ ادھر بھی جب پوسٹنگ ہوئی تو تین ہفتے میں دو خط ضرور آتے تھے۔ لیکن سر نومبر سے میرے خط آنے بند ہو گئے ہیں" پھر اس نے جیب سے ایک تصویر نکال کر مجھے دی اور کہا دیکھئے سر...... یہ آنکھیں میرا ہی انتظار کر رہی ہیں۔ ہیں نا سر؟" اس الھڑ لڑکی کی تصویر میں آنکھیں اور ہونٹ بڑے نمایاں تھے۔ "سر یہ تصویر اس وقت کی ہے جب ہم بی اے میں پڑھتے تھے۔ پھر میں یونیورسٹی داخل ہو گیا اور وہ گھر بیٹھ گئی۔ وہ ہمیشہ مجھے آرمی جوائن کرنے کے لئے کہتی تھی۔ اسے خاکی وردی بہت پسند تھی۔ سر میں تو لیکچرار بننا چاہتا تھا لیکن اس کی ضد اور پسند کی خاطر میں ادھر آ گیا۔ وہ مجھے پیار بھی تو ڈھیروں کرتی ہے نا۔ پھر مجھ سے ڈرتی بھی تو بہت ہے۔ اپنے کالج کے فنکشن میں بھی مجھ سے پوچھے بغیر نہیں جاتی تھی۔ اب میں اسے ابن انشا کی نظم لکھوں گا...... اک بار کہو تم میری ہو...... یا پھر آپ کوئی چاند اور چاندنی کے بارے میں نظم سنائیں۔ مگر وہ نہیں جو اس طرح ختم ہوتی ہے......" عارضی تھا چاند بھی اور عارضی تھی چاندنی۔ سر! چاندنی رات میں کسی ٹیلے پہ بیٹھ کر سگریٹ پینے اور شعر سننے سنانے کا مزا ہی اور ہے۔ یہ نشہ بادشاہی میں شاید ہو اور کہیں نہیں۔ سر ہمارے علاقے میں ریت بہت ہوتی ہے اور رات کو ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ ہم رات گئے

تک بیٹھے رہتے تھے۔ سر آپ ادھر آئیں گے نا؟ مائی گاڈ! آپ بہت انجوائے کریں گے۔ آپ کو میں ہرن اور مرغابی کا شکار کھلانے لے جاؤں گا"۔

اختر مجھے خواجہ فرید کے شعر اور کافیاں سناتا۔ جن میں روہی کی تعریفیں ہوتی تھیں۔

ایک دن کہنے لگا...... سر شانی بڑی شکی اور وہمی ہے۔ میری پوسٹنگ ادھر ہوئی تو اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا۔ مجھے پیار بہت کرتی ہے نا اسے ڈر تھا کہ مجھ پر بنگال کا جادو نہ چل جائے۔ سر ہم تو وطن کی حفاظت کرنے آئے تھے۔ وہ بالکل پگلی ہے۔ یہ باتیں نہیں سمجھتی۔ کہتی تھی۔ تیرا دوست کیپٹن مسعود وہاں ہے۔ وہ تجھے بھی بگاڑ دے گا۔ سر کیپٹن مسعود بھلا کون سے کیمپ میں ہو گا؟۔ کہیں ساتھ والے کیمپ میں ہی ہو تو مزا آ جائے مگر ملنے تو پھر بھی نہیں دیں گے۔ اچھا سر! ایک بات پوچھوں سچ بتائیں گے نا؟"

"ہوں" میں نے کہا

"سر! آپ نے بھی کبھی پیار کیا ہے؟" اس نے ذرا ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں...... کئی بار...... اور جی جان سے کیا ہے" میں نے جواب دیا۔

وہ پریشان ہو گیا اور کہنے لگا Sir dont tell me that آپ تو ہرجائی بالکل نہیں لگتے۔"

بھئی یقین کرو...... میں نے کئی دفعہ محبت کی ہے اور ٹوٹ کر کی ہے میں نے کہا "مگر کس سے"؟۔

"اچھے انسانوں سے...... اچھی کتابوں سے۔ خوبصورت موسیقی سے اور اپنے ملک کے ساتھ میں نے پیار کیا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر میں نے اپنے Profession کے ساتھ پیار کیا ہے۔

"اوہ آئی سی" وہ شرمندہ سا ہو کر بولا "سر جتنا پیار شانی میرے ساتھ کرتی ہے۔ دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ نہیں کرتا ہو گا۔ کر ہی نہیں سکتا" میں دل میں ہنس پڑا کہ ہر محبوب ایسے ہی محسوس

کرتا ہےاور یہی کہتا ہے۔

"شانی ایک آئیڈیل بیوی اور ماں ثابت ہوگی۔ کہا کرتی تھی کہ ہم اپنے بچوں کو بارہ سال کی عمر میں سکول داخل کرائیں گے اور اس وقت تک وہ انہیں اپنے گھر پڑھایا کرے گی۔ عربی' انگریزی' اردو سب کچھ پڑھایا کرے گی۔ پڑھانے کا اسے ویسے بھی بڑا شوق ہے مجھے بھی وقت بے وقت روک ٹوک کرتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی پیار کے ساتھ ڈانٹ بھی لیتی تھی بالکل استانیوں کی طرح"۔

ایک دن میں نے اسے چھیڑا "اختر ہوسکتا ہے وہ تمہیں بھول گئی ہو"

وہ بڑا جذباتی ہو کر کہنے لگا کہ اس کے بغیر شانی جنت بھی قبول نہیں کرے گی۔ اور اگر گھر والوں نے اس کی شادی کہیں اور کرنے کی کوشش کی تو وہ چوڑیاں پیس کر کھا لے گی" شانی کا یہ دعویٰ سن کر میں بالکل حیران نہ ہوا۔ کیوں کہ اس عمر کا عشق اس طرح کے دعووں اور وعدوں کے علاوہ انسان کو اور کچھ نہیں دیتا۔

ایک دن لیفٹیننٹ اختر نے اعلان کر دیا کہ اگر اس مہینے بھی خط نہ آیا تو وہ فرار ہو جائے گا۔ مگر یہ اعلان شانی تک نہ پہنچا۔ کیوں کہ اگلے دو مہینے بھی اس کا کوئی خط نہ آیا۔

اختر کے گھر سے تین چار خط ضرور آئے۔ ان میں بھی شانی کے بارے میں کوئی بات نہیں لکھی تھی۔

ایک دن افواہ پھیلی کہ کچھ سینئر افسر کیمپ سے جا رہے ہیں۔ منزل کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ مگر سمجھا یہ گیا کہ وطن واپسی ہو رہی ہے۔ اختر نے مجھے مبارک باد دی اور کہا "سر! میرے گھر ضرور جائیں۔ انہیں تسلی دیں کہ میں خیریت سے ہوں۔ جلدی آ جاؤں گا۔ گھبرائیں مت۔ اور سر شانی سے ضرور ملیں۔ ہمارے سامنے والا گھر ہے ان کا۔ نیلے گیٹ پر ہمیشہ ایک چھوٹا سا سفید کتا بیٹھا رہتا ہے۔ مگر وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ شانی کو آپ پہچان ہی لیں گے۔ اسے ذرا ڈانٹیں بھی کہ خط کیوں نہیں لکھتی؟

اب لیفٹیننٹ اختر نے پنجرے چھوڑ دیئے تھے اور نہ ہی وہ اخبار "آزادی" اور "جمہوریت" کی پتنگیں بناتا تھا۔ لوگوں سے بھی اس کا میل جول کم ہو گیا تھا وہ چپ چپ اور اداس رہنے لگا تھا۔

کچھ دنوں بعد میرے ساتھ دو اور سینئر افسروں کی روانگی ہوئی۔ سب نے مبارک بادیں اور پیغامات دے کر ہمیں کیمپ سے رخصت کیا۔ ہمیں وطن کی بجائے ایک اور کیمپ میں انکوائری کے لئے بھیج دیا گیا اور چار ہفتے بعد پھر اسی کیمپ میں واپس لا کے چھوڑ دیا گیا۔ یہاں ایک افسوس ناک خبر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ پتہ چلا کہ اختر ایک میجر کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش میں دنیا سے ہی فرار ہو گیا ہے۔ میجر منصور تو پہلے فائر کے ساتھ ہی شہید ہو گیا۔ لیفٹیننٹ اختر گولی کھا کر گر پڑا اور فوراً ہی اٹھ کر پھر بھاگا۔ سنتری نے بالکل نزدیک جا کر دوسرا برسٹ مارا تو اختر نے وہیں دم توڑ دیا۔

پھر بہت سا وقت گزر گیا۔ ان دو شہید افسروں کی برسی عید اور شب برات ہم نے اسی کیمپ میں منائیں کافی دیر بعد جنگی قیدیوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ آخر ایک دن ہم نے بارڈر پر پہنچ کر اپنے دیس کی مٹی پر سجدہ کیا۔ وطن واپسی کے بعد میرے چار مہینے بڑے مصروف گزرے۔ کئی بار میں نے لیفٹیننٹ اختر کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔

میری پوسٹنگ ہوئی تو میں نے راستے میں اس کے گھر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے گھر والے مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔ بڑی محبت اور تواضع سے ملے۔ جنگ اور کیمپ کے قصے چھڑ گئے۔ اختر کی ماں رونے لگی تو اختر کے ابا جی نے ڈانٹ دیا۔ میرے لئے انہیں تسلی دینا مشکل ہو گیا۔ اختر کی ماں کہنے لگی۔ "مجھے بیٹے کا اتنا دکھ نہیں۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اتنے بیٹوں کی قربانی بھی ملک کو نہ بچا سکی"۔

ہم چائے پی رہے تھے کہ کیپٹن مسعود آ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم اختر کے والدین سے اجازت لے کر چل پڑے۔ گھر سے نکلتے ہی ہم دونوں کی نظریں ایک ساتھ

سامنے گئیں۔ نیلے گیٹ کے باہر ایک رشین پپ بیٹھا تھا۔ میں نے کہا ’’کیپٹن مسعود! پتہ ہے یہاں کون رہتا ہے؟‘‘

’’بس سر!‘‘ کیپٹن مسعود نے جواب دیا۔ یہاں ایک لڑکی رہتی تھی جس کو آرمی افسر بہت پسند تھا۔ اور اب وہ ایک سی ایس پی افسر کی بیوی ہے۔‘‘

نیلما ناہید درانی

قلعہ شبد یو سنگھ کا بابا

لاہور سے فیصل آباد جاتے ہوئے روڈ پر دائیں ہاتھ ایک ڈرائیور ہوٹل تھا۔ اس سڑک پر دونوں طرف کئی ڈرائیور ہوٹل تھے۔ چھپر والی چھت' بڑا سا تندور۔ بان سے بنی ہوئی لکڑی کے بڑے بڑے پایوں والی چارپائیاں جن پر مٹی کی منکیاں پانی سے بھری رکھی ہوئی تھیں۔ پلاسٹک کے میلے کچیلے گلاس۔ سارے ڈرائیور ہوٹل ایک جیسے ہی تھے۔ جہاں ٹرک ڈرائیوروں کے لئے کڑک چائے اور بڑے گوشت کے قورمے کے ساتھ تنور کی لال لال گرم روٹیوں کا انتظام ہوتا تھا۔ عام گاہکوں کے لئے ماش کی دال' اچار' کچے پیاز اور روٹی۔ جس کا مزا ساری دنیا سے نرالا تھا۔ بڑے بڑے فائیو سٹار ہوٹلوں کے کھانے بھی اس دال روٹی' اچار اور پیاز کے مزے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

مگر قلعہ شبد یو سنگھ کا وہ ڈرائیور ہوٹل ایک بابے کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک پچانوے برس کا بابا۔ جو جوانوں کی طرح چلتا تھا۔ اس کے سر کے بال بھی آدھے سفید اور آدھے کالے تھے۔ آنکھوں کی روشنی پوری تھی۔ وہ ہر روز شام کے وقت اس ڈرائیور ہوٹل پر آ کر بیٹھ جاتا اور اس کے انتظار میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر چھائی ہوئی انتظار کی اداسی ختم ہو جاتی۔ اور ہر ایک اس بابے کے پاس جا کر اپنا مسئلہ بیان کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ سب لوگ لاہور فیصل آباد اور دوسرے شہروں سے آتے تھے۔ اور اس بابے سے صحت تندرستی کے ساتھ لمبی عمر کا راز پوچھنا چاہتے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ بابا جی کے پاس کوئی آب حیات کا پیالہ ہے کہ وہ اس عمر میں بھی جوانوں کی طرح چلتے ہیں۔ اور بغیر نظر کی عینک کے اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ قلعہ شبد یو سنگھ کے اس ڈرائیور ہوٹل کا مالک شیدا تھا جو بابا جی کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔

عصر کی نماز کے بعد بابا جی شیدے کے ہوٹل پر آتے۔ اس وقت تک ہوٹل کی ساری

چارپائیاں گاہکوں سے بھر چکی ہوتی تھیں۔ بابا جی ایک چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور ہوٹل کے "چھوٹے" ان کی ٹہل سیوا کرنے لگ جاتے۔ بابا جی چائے وائے پی لیتے تو دوسری چارپائیوں پر بیٹھے گاہک باری باری بابا جی کے پاس آتے۔ بابا جی بھی بڑے ہوشیار تھے۔ بندہ دیکھتے ہی انہیں پتہ چل جاتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کون دوسری شادی کرنے کے شوق میں آیا ہے۔ اور کون سدا جوان رہنے کی کوشش میں ہے۔ کسے صرف پہلوانی کا شوق ہے اور کون کسی بیماری سے پریشان ہے۔

ہر شخص بابا جی کو اپنے دل کا حال سناتا اور بابا انہیں اپنی صحت کے کارنامے سنا سنا کر حیران کرتا جاتا اور ساتھ ہی اپنی دھوتی کے پلے بندھی کنجی کھول کر دیوار کے ساتھ لگی لکڑی کی چھوٹی سی الماری کھولتا۔ چھوٹی چھوٹی شیشیاں دکھاتا اور ان کی قیمت بتاتا جاتا۔ ان شیشیوں کے اندر آب حیات تھا۔ سونے چاندی کے کشتے، سدا جوان رہنے کے نسخے۔ بابا لوگوں میں زندگی کی امیدیں اور خواب بانٹتا تھا۔ جوان شیشیوں میں چمکیلی گولیوں کے روپ میں رہتے تھے۔

گاہک ہاتھوں ہاتھ وہ شیشیاں خرید لیتے۔ بابا جی کڑکڑ کرتے نوٹ اپنی جیب میں ڈالتے اور مغرب کی اذان سے پہلے ہی سارے گاہکوں کو نمٹا لیتے۔ ڈرائیور ہوٹل کی چارپائیاں خالی ہو جاتیں اور بابا جی اٹھ کر اپنے گاؤں کی طرف چل پڑتے۔ شیدے کا یہ ڈرائیور ہوٹل بابا جی کے دم سے آباد تھا۔ اسی لئے اس نے اپنے نوکروں کو بابا جی کی ٹہل سیوا کرنے کی خاص ہدایت کی ہوئی تھی۔

سارے ڈرائیور ہوٹلوں کے مالک شیدے کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ کیونکہ ساری روڈ کے گاہک صرف اس کے ہی ہوٹل پر رکتے تھے۔ لاہور سے چلتے ہی قلعہ شبد یو سنگھ کا خیال رکھتے کہ کہیں بھول کر آگے نہ گزر جائیں اور یوں بابا جی کے درشن سے محروم نہ ہو جائیں۔

رونق بھی جب لاہور سے سواریاں لے کر فیصل آباد جاتا تو راستے میں قلعہ شبد یو سنگھ کے اس ڈرائیور ہوٹل پر ضرور رکتا۔ کیونکہ اس کی جیبوں میں وہ نوٹ بھی ہوتے تھے جو اس کے ملنے

والوں نے اپنی اپنی فرمائشوں کے لئے دیے ہوتے۔ وہ بابا جی سے کشتوں سے بھری گولیوں کی شیشیاں لیتا اور اپنے دوستوں کی فرمائشیں پوری کرتا۔ بابا شاید عمر خضر لکھوا کے آیا تھا۔ کئی سال گزر گئے تھے۔ بابا ویسے کا ویسا تھا۔ کبھی کسی نے بابا جی کو بیمار نہیں دیکھا۔ خود ہی چل کر اکیلا آتا اور نوٹوں کو جیب میں بھر کے اکیلا ہی بغیر کسی سہارے کے چل پڑتا۔

رونق ہفتے میں ایک بار ضرور وہاں سے گزرتا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ دو ہفتے تک قلعہ شبد یو سنگھ نہ جا سکا۔ اس کے بڑے بھائی کی شادی تھی۔ کام کاج میں ہی دو ہفتے گزر گئے۔ پندرہ دن بعد وہ اپنی گاڑی لے کر فیصل آباد روڈ کی طرف چل پڑا۔ اس کی جیبوں میں اب بھی لوگوں کی فرمائشوں کی پرچیاں اور نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

رونق جب شیدے کے ہوٹل پر پہنچا تو وہاں عجیب سی ویرانی تھی۔ نہ کوئی گاہک تھا نہ ہی تنور پر روٹیاں لگ رہی تھیں۔ رونق نے بان کی چارپائی پر بیٹھ کے مٹی کی چاٹی کو منہ لگا کے ایک ہی گھونٹ میں پانی پی لیا پھر ادھر ادھر دیکھا اور سوچنے لگا کہ کیا یہ قلعہ شبد یو سنگھ ہی ہے۔ رونق نے پاس کھڑے ایک لڑکے سے پوچھا۔ لڑکے نے ہاں میں سر ہلایا تو رونق نے دوسرا سوال کیا۔ کیا بات ہے آج گاہک نظر نہیں آ رہے۔ بابا جی کے آنے کا ٹائم تو ہو گیا ہے۔ یہ سن کر اس لڑکے نے رونق کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ اب بابا جی نہیں آئیں گے۔ وہ پچھلے ہفتے فوت ہو گئے ہیں۔

"یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے پاس تو سدا جوان رہنے کے کشتے تھے۔ اور انہیں تو کوئی بیماری بھی نہیں تھی"

اتنی دیر میں ہوٹل کا مالک شیدا بھی آ گیا۔ "بھائی جی! ہمارا تو ہوٹل ہی بند ہو گیا ہے! اب کوئی گاہک نہیں آتا۔ انسان کتنا ہی جی دار ہو کتنے ہی کشتے کھا لے۔ پر ایک دن موت سے ہار جاتا ہے۔ بابا جی موت سے ہار گئے ہیں۔ مگر ہماری تو روزی ہی ختم کر گئے ہیں۔"

اس سڑک سے اب بھی ہزاروں گاڑیاں گزرتی ہیں۔ پر کوئی قلعہ شبد یو سنگھ نہیں ٹھہرتی۔ کیونکہ وہاں اب زندگی کی امیدیں اور خواب بانٹنے والا بابا نہیں رہا۔

سرائیکی افسانے

غلام حسن حیدرانی

مشتِ خاک

پوہ ماہ کی رات۔ بادلوں کی گھن گرج طوفان بادوباراں دل کہتا ہے کہ چھت ابھی گری۔ گاموں رضائی لپیٹے حقہ پی رہا ہے۔ یہ حقہ وہ شام سے پی رہا ہے اب تو آدھی رات ڈھل چکی ہے۔ تمباکو جل گیا ہے۔ کچھ اور پشاوری تمباکو مل کر اس نے چلم میں ڈالا اور تیلی سے اسے جلایا ہے۔ زور سے ایک کش لیتا ہے اسے اپنی آنکھیں بھیگی ہوئی لگتی ہیں۔ انگلی آنکھوں کو لگاتا ہے تو انگلی پر خون لگا ہوا دیکھتا ہے۔ ٹھنڈی آہ بھرتا ہے تو سانس میں سے جلے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔ اس کا حافظہ اسے کئی سال پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔ آہ گاموں جس گلی میں سے گزرتا لڑکیاں ایک دوسرے کو بلا بلا کر کہتی تھیں۔ ''اری آنا۔ دیکھو گاموں جا رہا ہے۔''

اس کے چہرے کا رنگ سنگترے کی طرح تھا۔ جوانی کے دن۔ جسم میں نیا خون۔ گاموں یاروں کا یار۔ دوستوں کا دوست۔ ساتھیوں کا ساتھی۔ دکھوں کا بیلی۔ شادی ہو غمی ہو۔ کسی جوان کا سہرا ہو۔ اجنبی آدمی کی آنکھ بھی گاموں پر جا کر ٹھہر جاتی تھی۔ ہر محفل کا دولہا۔ مسجد جاؤ تو پکا مولوی۔ اکھاڑے میں دیکھوں تو کشتی کا استاد۔ کبڈی ہو یا کوئی اور کھیل۔ اچھے اچھے گھبرو اس سے دبتے تھے۔ عشق کے معاملے میں سب سے آگے۔ بستی کی ایسی ایسی لڑکیاں اسے چاہتی تھیں۔ جن کی ایک مسکراہٹ کے لئے گھبرو ترستے تھے۔

کئی بار گاموں گھر روٹی کھا رہا ہوتا تو ماں کہتی۔ بیٹے! لوگ بیٹیوں کی شادیاں کر رہے ہیں میں دمے کی مریض ہوں پتہ نہیں کس وقت سانس نکل جائے۔ میں تجھے سیج پہ بیٹھا دیکھ لیتی۔ گاموں جواب دیتا۔ اماں! ابھی وقت نہیں آیا۔''

''میں تیری مرضی کی شادی کروں گی''۔ باپ نے بھی کئی دفعہ گاموں کو کہا فلاں فلاں

لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ تو شادی کر لے'' مگر گاموں کا ایک ہی جواب تھا۔ ''وقت تو آئے''۔

پتہ نہیں گاموں چچا کی دس سال کی بیٹی بالو سے محبت کرتا تھا یا خاندان کی ...... سبب کوئی بھی ہو۔ گاموں کی آنکھ بالو سے ہٹتی نہ تھی۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بالو کے سوا کسی اور لڑکی سے اس کی شادی ہو۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن گاموں کی ماں بہت بیمار ہو گئی۔ گاموں گھر آیا تو ماں نے کہا ''بیٹا! تجھے میرا کوئی خیال نہیں؟ گاموں نے جواب دیا ''اماں! کیسے؟''

''تو شادی کیوں نہیں کرتا؟'' گاموں کی آنکھوں میں بالو کی تصویر گھوم گئی۔

''اماں میں نے کب منع کیا ہے؟ تمہیں صحت ہو جائے تو میں شادی کر لوں گا۔''

گاموں کی بات سن کر گاموں کی ماں کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ کہنے لگی۔ ''بیٹا میں ٹھیک ہوں''۔

گاموں نے کہا اچھا اماں! چچا کو کہو...... میں تمہارا کہا کیسے ٹال سکتا ہوں؟

گاموں کی ماں کا بخار اتر گیا۔ اٹھ کر دیورانی آلو کے پاس گئی۔

''بہن! تم گاموں کو اپنا بیٹا بنا لو'' آلو نے کہا ''بہن گاموں ہمارا بیٹا ہے۔'' گاموں کی ماں نے کہا۔ اچھا پھر بالو ہماری بیٹی ہو گئی۔''

بالو کی ماں ہنس پڑی۔ رات کو گاموں کی ماں نے اپنے گھر والے سے بات کی۔ گاموں کا باپ چار بھائی لے کر بھائی کے پاس گیا۔ ''بھائی! اگر تم مہربانی کرو تو میں گاموں کو تمہیں دینے آیا ہوں۔''

بالو کی ماں اپنے گھر والے سے پہلے بات کر چکی تھی۔ بالو کے باپ نے کہا ''بھائی! مجھے گاموں سے بڑھ کر کون ہے۔ گاموں میرا بیٹا ہے۔''

گاموں کا باپ گاموں کی شادی طے کر کے گھر آ گیا۔ گاموں کی شادی بڑے دھوم دھڑکے سے ہو گئی۔ یوں تو ساری برادری شادی میں شریک ہوئی مگر وہ رشتے دار جو گاموں کو رشتہ

دینا چاہتے تھے اور وہ جو بالو کی خواہش رکھتے تھے۔ دل ہی دل میں گاموں سے جل کر رہ گئے ۔ اللہ کے کام نرالے ہیں۔ بالو اپنے خیال میں اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر گاموں کے حسن سلوک کا حال بڑے چاؤ سے بیان کرتی۔ مگر شیطان ہر کسی کے ساتھ ہے۔ دور شتے دار لڑکیوں نے گاموں کے قریب ہونے کی کوشش کی۔ لیکن گاموں نے ان کو منہ نہ لگایا۔ تو وہ الزام تراشی پر اتر آئیں۔ گاموں اگر چہ کوئی فرشتہ تو نہ تھا مگر جس شخص نے خاندان سے باہر شادی کا تصور بھی نہ کیا تھا وہ خاندان کی عزت کا دشمن کیسے ہو سکتا تھا؟۔

عورتوں کی کھوپڑی الٹی ہوتی ہے۔ گاموں کے خلاف کئی چکر چلنے لگے۔ گاموں اپنی نیک نیتی اور شرافت کے ساتھ ہر دکھ کو ٹالتا رہا۔ یہ نہیں کہ گاموں کو ان باتوں کا علم نہیں تھا بلکہ گاموں کانے کو منہ پہ کانا کہنے والوں میں سے نہ تھا۔ ایک دو دفعہ اپنی بیوی سے اس نے بات کی کہ لوگ میرے راستے میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔ تم ذرا خیال رکھنا۔ لیکن عقل کی کچی بیوی نے کچھ خیال نہ کیا۔ گاموں کو باپ نے الگ کر دیا۔ بھائی الگ ہو گئے کچھ رشتے دار اس تاڑ میں رہے کہ کسی طرح گاموں کی عزت جو لوگوں کی نظروں میں بہت تھی ختم ہو جائے۔ کچھ جھوٹے سچے مقدمے بھی اس پر بنائے گئے۔ گاموں ہنس کھیل کر وقت گزارتا رہا۔ مگر تقدیر ابھی کچھ اور امتحان لینے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔

گاموں کے بچے بڑے ہو گئے تو سگے بھائی بھی مڑ کر نہ آئے کہ ہم تجھے گلے لگانے کو تیار ہیں۔ گاموں نے گھر والی سے بات کی میں تجھے کہتا تھا کہ میرے راستے میں کانٹے بچھ رہے ہیں مگر تیری سستی اور بے پروائی آج رنگ لائی ہے۔ گاموں نے مجبور ہو کر اپنے بڑے لڑکے کا رشتہ غیروں میں کر دیا۔ شادی میں کوئی عزیز نہ آیا۔ بس اپنے تین بیٹے ساتھ رہے۔ بیٹوں نے کسی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔ وقت اچھا گزر گیا لیکن تقدیر کی باتیں تقدیر ہی جانتی ہے گاموں باہر گیا ہوا تھا پیچھے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا گاموں گھر آیا تو میت کو غسل دیا جا چکا تھا۔ بیٹے کو باپ نے کندھا دیا تو دل میں ٹیس اٹھی۔ مجھے کندھا کون دے گا؟ دل نے تسلی دی کہ پیارا اور جندو جو ہیں پریشان نہ

ہو۔ اللہ کے کیے پر صبر آ ہی جاتا ہے۔ مہینہ ڈیڑھ گزرا گاموں باہر تھا واپس آیا تو پیارے کو گاموں کے ایک رشتے دار نے کلہاڑے سے قتل کر دیا۔ گاموں نے پیارے کے جنازے کو بڑے حوصلے سے کندھا دیا۔ مگر خالی حوصلہ کیا کرتا جب دونوں کندھے ہی نہ رہے۔

آج رات کا پچھلا پہر ہے گاموں پھر تمبا کو حقے میں ڈالتا ہے۔ کش لیتا ہے۔ دھواں نکالتا ہے دھوئیں کے ساتھ پنجرے کا پنچھی پھڑک کر باہر آ جاتا ہے۔ خالی پنجرہ گر جاتا ہے۔ صبح کو دنیا گاموں کے جنازے کی طرف دیکھتی ہے۔ چارپائی پر گاموں کی جگہ ایک مشت خاک پڑی ہے۔ بس مشتِ خاک۔

دلشاد کلانچوی

رات کی دیوار

زیناں رات کو تھک ہار کر چارپائی پر لیٹ تو گئی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ معلوم نہیں اس کا دھیان درختوں کی طرف کیوں چلا گیا۔ درخت کٹ کر گر جاتے ہیں۔ مر جاتے ہیں۔ سوکھ جاتے ہیں۔ کاٹ پیٹ کر انہیں ہل بنا لیا جاتا ہے یا کوٹھے کی چھت کو سہارا دینے والا شہتیر بن جاتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ بن ہی جاتے ہیں۔ زیناں کو یوں لگا جیسے وہ کچھ بھی نہیں اور نہ ہی کچھ بن سکی ہے۔ لیکن کیوں؟ عظیماں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کتنی عظیم عورت ہے عظیماں! ملک رحمٰن کے گھر اس کی حکومت ہے۔ جو مرضی ہو کرتی ہے۔ کتنی آزادی ہے۔ لیکن میں تو بس دیوار کی دیوار ہوں۔ اس نے دیکھا کہ کوٹھے کے شہتیر پر ایک کڑی نے دوسری کڑی کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا ہے۔ لڑنا کتنی بڑی جبلت ہے یا علت حیوان بھی نہیں بچ سکا تو انسان کیسے بچ سکتا ہے؟ مگر عظیماں سے وہ لڑے تو کیسے لڑے؟

زیناں کا دھیان اپنے بیٹے کی طرف چلا گیا۔ چلا گیا گیا دیوار پار کر گیا۔ وہ جیل میں سویا ہوا ہوگا۔ یہ نیند بھی کیا جادو ہے! کہتے ہیں سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے مگر کہاں؟ یہ بات سچ ہوتی تو زیناں پتہ نہیں کہاں کے خواب دیکھ رہی ہوتی، دیوار کہیں کی! اسے خواب دیکھنے کی فرصت ہی کہاں ملتی تھی، پھر بھی اس کی حسرت تھی کہ خواب مول بکتے ہوتے تو مول لے آتی۔ اس کے دل نے کہا شہد بھی میٹھا ہے لیکن آئے کہاں سے؟ اس کی بہن شریفاں کے گھر بوتل بھری ہے جو نیڑی کے شہتیر کے کنارے لٹکی ہوئی ہے پتہ نہیں شریفاں کا جی کیوں نہیں کرتا۔ دنیا میں میٹھی چیزیں بہت ہیں پر مجھے کیا؟ زیناں نے دیکھا کہ کوئی پیسوں کو ہاتھ مار کر اٹھا رہا ہے لیکن وہ آدمی نظر نہیں آتا ہوگا کوئی ضرورت مند۔

ضرورت نہ بھی ہو۔ پیسہ ہے بھی ایسی شے جو ہو تو تب بھی خواہش نہ ہو تو بھی خواہش۔ زیناں کا بیٹا بھی تو اس پیسے کے پیچھے قید ہوا پڑا تھا۔ کم بخت کو بدنصیبی نے آ لیا۔ بھلا گھر میں پیسوں کی کمی ہے؟ باپ سوتیلا ہے میں تو نہیں۔ آج کل کے بیٹے سگی ماؤں سے بھی غیر ہو گئے ہیں۔ کوئی ایسی ہوا چلی ہے کہ ہر کسی نے غربت اور تنہائی کی پوشاک پہن رکھی ہے اور اجنبی بنا پھرتا ہے۔ پھر یہ شور کیسا کہ ہمارا کوئی نہیں ہم اکیلے ہیں۔ مجھے تو تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں ان لوگوں نے تنہائی کو گلے سے کیوں لگا لیا ہے؟ کہتے ہیں ایک شخص سونے کا جنگلا بنوا کر اس میں جا بیٹھا اور باہر سے تالا لگا دیا اور پھر دہائی دینے لگا لوگو! میں پنجرے میں ہوں میں تنہا ہوں میں اداس ہوں میں مشکل میں ہوں۔ زیناں کو اپنا بیٹا بھی ان جیسا لگتا تھا۔ پھتو کی دکان میں نقب لگانے کی بجائے مجھ سے پیسے مانگ لیتا۔ ابھی تو ملک صاحب کپاس دے کر منڈی سے پانچ چھ ہزار روپے لے کر آئے تھے چلو صندوقچی کو تالا لگا ہوا تھا۔ چابی تو میرے ہاتھ میں تھی۔ پتہ ہوتا تو...... اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی تو زیناں کے خیال کی زنجیر ٹوٹی، کون ہوگا؟ میرا گھدن تو نہیں ہو سکتا۔ بھلا جیل کے پنجرے میں سے کون نکل کے بھاگ سکتا ہے؟ وہ خیالوں کا لحاف اتار کے اٹھی، دروازہ کھولا تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر آ گیا، زیناں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ بندہ بہت بھولا ہے بہرحال ٹھنڈی اور تازہ ہوا کے جھونکے نے اسے تر و تازہ کر دیا۔ تازہ ہوا اور تازہ پانی بڑی نعمتیں ہیں۔ بڑے نائک ہیں۔ اسے اپنے خاوند پر غصہ آیا۔ بوتلوں کا پانی پی پی کر ادھ موا ہوا پڑا تھا۔ پھر فوراً سے یوں لگا جیسے یہ پانی اور یہ ہوا بھی بناوٹی اور مصنوعی چیزیں ہیں اور بوتلوں والی دوا اصلی اور عمدہ ہے۔ پہلے اسے نیند آ جاتی تھی مگر اب نیند بھی اس سے روٹھ گئی تھی۔ نیند کے روٹھ جانے سے یہ خیالات چھا جاتے ہیں۔ نیند آئے تو کہاں سے آئے؟ پھر یہ خیال کا گھوڑا بھی تو بے باگ ہی دوڑتا ہے اور بے حساب بھی اور ہاتھ نہیں آتا۔ ہاتھ بھی کیا آئے؟ ابھی ہے اور ابھی نہیں، خیالوں کو برا بھلا کہتے کہتے وہ خود خیالوں کا جھولا جھولنے لگ گئی۔ یکدم زیناں کی چیخ نکل گئی چوہا کسی طرح اس کی چارپائی پر آ چڑھا، کپڑا جھٹکا تو چوہے کو دم دبا تے بھاگتا دیکھا وہ مسکرا اٹھی شاید

اسے اپنے خاوند ملک صاحب کا خیال آ گیا تھا۔ ایک رات اسے نیند آئی ہوئی تھی۔ ملک صاحب نے اس کے بازو پر گدگدی کردی تھی۔ ملک صاحب نے زیتاں سے دوسری شادی اولاد کی خاطر کی تھی۔ اس خیال نے اس کے بیٹے کھدن کو پکڑ لیا تھا اور زیتاں کے آگے لا کھڑا کیا۔ زیتاں اسے برا بھلا کہنے لگی۔ کتنے ارمانوں سے اس کو جنم دیا تھا اس نے...... پھر وہ ایک فلسفی بن گئی۔ اور کہنے لگی اگر ماں جننے سے پہلے اپنی اولاد کا کردار دیکھ سکتی تو کیا کرتی؟ کوئی خوفناک خیال اسے آیا۔ تو فلسفہ چھوڑ کر زیتاں بن گئی اور سونے کی کوشش میں لگ گئی۔

ایک دن ملک صاحب نے اسے نیند کی گولیاں دکھا کر کہا کہ نیند بھی مول بکتی ہے۔ لیکن وہ نیند اصلی تو نہیں ہو سکتی۔ میٹھی من بھاونی! پتہ نہیں وہ کیوں ان گولیوں کو برا بھلا کہنے لگ گئی۔ وہ پھر فلسفی بن چکی تھی۔ نامراد دواؤں اور ایجادوں نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا۔ دواؤں کا فریج بنا دیا ہے۔ دوائیں کھاؤ' کیپسول نگلو' گولیاں چوسو' یہ ختم ہو جائیں تو ٹیکے لگواؤ' سائنس نے کتنی سہولتیں مہیا کر دی ہیں۔ وہ اٹھی' شاید اس کے میاں کے پاس نیند کی گولیاں ہو۔ وہ دواؤں اور ٹوٹکوں کا عادی ہو چکا تھا اور رات کو عام طور پر گولی کھا کے سوتا تھا اور پھر دن چڑھے جاگتا تھا۔ یہ گولی اسے مار دیتی تھی اور پھر سورج کی روشنی اسے نئی زندگی بخشتی تھی اور وہ جی اٹھتا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ نیند کی گولی انسان کو صحت بخش نعمتوں سے کتنی محروم کر دیتی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر وہ خاوند کی طرف گئی۔ مگر اسے کوئی خیال آیا تو پھر واپس چارپائی پر آ گری۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے اس کا جسم شل ہوتا گیا وہ برف کی ٹھنڈی چاٹی بن گئی۔ اس کے خیالات بھی ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ وہ خود بھی شل ہو گئی تھی۔ بھلا کوئی گرمی اس برف کو پگھلانے والی کہاں سے آتی؟ جیسے برف میں بھی کوئی بوٹا اگ آتا ہے ایک خواب اس کے سر لہو میں رینگنے لگا اور اس کے اندر ہل چل مچانے لگا۔ ''اٹھو! میں تجھے جگانے آیا ہوں۔ کب کی سوئی ہوئی ہے۔ رات کتنی گزر گئی ہے! شاید موذن اذان دینے والا ہو گا۔ لیکن چھوڑ ان باتوں کو۔ آ میرے ساتھ مگر تو تو خواب ہے' زندگی کا بدل تو نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر کوئی خوابوں میں زندگی کے دن گزار لیتا۔ مگر کہاں؟ ان دواؤں نے

تو اسے جینے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ پتہ نہیں میری ماں کیسے سویا کرتی تھی جب کبھی میں اس کے ساتھ سو جاتی اس کے خراٹے ڈرا دیتے تھے۔

زیتاں کہیں جا رہی تھی' دور بہت دور' کوئی درخت اسے بلا رہا تھا' درختوں میں بھی جان پڑ گئی ہے۔ یہ تو صرف پانی پیتے ہیں اور ہوا کھاتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں اس نے ایک لمبی سی شاخ کا سہارا لیا۔ وہ اپنی اس حرکت پر شاید خوش ہوتی لیکن ہوا کے ایک جھونکے نے اس کی چارپائی کے قریب کھڑکی کو دھکا دے کر کھول دیا تھا۔ اس کے کھڑکے نے اسے جگا دیا تھا اور صبح ملک صاحب کے لئے چائے بنانے میں وہ مصروف ہو گئی۔

بشریٰ رحمٰن

کلمہ شہادت

جبار خان نے لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھا اور لڑکی کی چیخ گلے میں ہی گھٹ گئی۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟ لیکن اس کا خوفزدہ چہرہ بتا رہا تھا کہ بہت اندھا، بہت خطرناک واقعہ ہونے والا ہے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ گلی میں خاموشی تھی۔ پتہ نہیں نانی اماں کہاں تھی؟ تھی تو یہیں کوٹھے میں لیکن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت تو فقط وہ درندہ صفت انسان تھا اور اگلے لمحے اللہ جانے کیا ہونے والا تھا؟ وہ اس کی لال لال آنکھوں کو دیکھ کر خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ تیرہ چودہ سال کی کلی تھی نرم اور نازک ننھی سی جان جو تھوڑی دیر پہلے نیند کے جھولے میں ہلکورے لے رہی تھی۔

''میں کیا کروں؟''

جبار خان نے اپنے دل میں سوچا' معصوم ہے' کم عمر ہے' لیکن میری کیا لگتی ہے؟ مجھے تو حساب بیباق کرنا ہے۔ اس نے ایک بار پھر شیطانی نظروں سے اس معصوم لڑکی کو دیکھا۔ روپے پیسے کا حساب عمر اور رشتوں کے لحاظ سے طے نہیں ہوتا۔ جس وقت دو آدمی اکھاڑے میں اترے ہوں اس وقت ہر قسم کا داؤ استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

اور آج کی گھڑی بڑی انتظار کے بعد ہاتھ آئی تھی۔ جبار خان نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ اس کوٹھے میں بلی کی طرح چپکے سے آ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیسی خوشبو تھی' ناگوار خوشبو تھی۔ خوشبو تو ناگوار نہیں ہوتی۔ ایسی مہک کو بدبو کہتے ہیں لیکن یہ بدبو بھی ہرگز نہ تھی۔ یہ خوشبو تھی۔ تیزی سے آئی اور جیسے جبار خان کے نتھنوں میں گھس گئی۔

''ہا'' جبار خان نے سوچا۔ جب شہر کے مضافات میں مینہ برستا تھا تو گڑھوں میں مینہ کا

پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ کئی کئی دن تک کھڑے پانی کے قریب سے گزرو تو ایسی ہی بو آتی تھی۔ ''ہا'' کبھی کبھی کسی قبرستان کے پاس سے بھی گزریں تو اس قسم کے جھونکے نتھنوں کے اندر گھس جاتے ہیں۔ وقت بہت کم تھا۔ ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

جبار خان نے اپنی خبیث نظروں سے اس زرد چہرے والی کانپتی لڑکی کو دیکھا اور پھر حاجی واصف علی کی صورت اس کی نظروں میں گھوم گئی۔ ''کمینہ'' اس نے تصور میں دانتوں کو پیس چھوڑا۔ پچاس ہزار روپے تو تھے اور میں وصول کرنے کے سو طریقے جانتا ہوں۔ حاجی واصف علی کے پاس بہت پیسہ ہے۔ اسے تو پیسے کی چوٹ لگے گی بھی نہیں۔ جسے جہاں درد ہو وہاں چٹکی لینی چاہیے کچھ عرصے پہلے جبار خان اور واصف علی نے مل کر برف کا ایک کارخانہ لگایا تھا۔ کارخانہ تو بہت چلا۔ مگر جس وقت سردیاں شروع ہوئیں تو کاروبار مندا پڑ گیا۔ اس وقت جبار خان نے واصف علی کو مشورہ دیا کہ سردیوں میں یہاں چھٹی صاف کرنے کی مشینیں لگالیں۔ مشینوں پر سارا دن جبار خان کام کرتا تھا۔ دو چار سال گزرنے کے بعد دونوں نے مل کر قالین ایکسپورٹ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ جبار خان پڑھا لکھا نہ تھا۔ اس لئے واصف علی دوسرے ملکوں میں جانے لگا۔ ملک ملک پھرتے پھرتے اسے حج کا خیال آیا اور وہ حاجی واصف علی بن گیا۔ اس کی جائیداد بن گئی۔ بچوں کی شادیاں ہو گئیں۔ مگر جبار خان جبار خان ہی رہا۔ کچھ عرصہ بعد دونوں میں ان بن ہو گئی تو انہوں نے اپنا اپنا پیسہ الگ کر لیا۔

جبار خان حاجی واصف علی کے سلوک سے خوش نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پچھلے سال مال کا منافع جو پچاس ہزار بنتا تھا واصف علی نے اسے نہیں دیا۔ جبکہ واصف علی کا خیال تھا کہ وہ پچھلے سال الگ الگ ہو چکے تھے۔ جبار خان مقدمے بازی میں وقت ضائع کرتا رہا اور واصف علی کام کرتا رہا۔ بات بڑھی تو دوستی دشمنی میں بدل گئی۔

حاجی واصف علی کا ایک بیٹا تھا جو امریکہ پڑھنے چلا گیا تھا وہاں باپ کے کاروبار کا بھی خیال رکھتا تھا۔ ایک بیٹی تھی جو ڈی ایس پی کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ کئی دن سے جبار خان حاجی

واصف علی سے انتقام لینے کا سوچ رہا تھا۔ حاجی واصف علی جبار خان سے دس پندرہ سال بڑا تھا۔ اس کی لمبی داڑھی اور بزرگی اس کے سامنے آ جاتی تھی۔ مگر اس عمر میں وہ حاجی کو نقصان بھی کیا پہنچائے؟ حاجی کو قتل کرنے سے اس کا مقصد حل نہ ہو سکتا تھا۔ سارے شہر والے جانتے تھے کہ ان کے درمیان مقدمہ چل رہا ہے۔ پھر حاجی کا داماد ڈی ایس پی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حاجی کو ایسی جگہ پر چوٹ لگائے جہاں نشان نظر نہ آئے مگر درد بہت ہو۔ بوڑھے آدمی کو درد کہاں ہوتا ہے؟ اس کا ایک دن اسے پتہ چل گیا۔ حاجی واصف علی سرگودھا سے واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی تھی۔ حاجی کی بیٹی اور داماد اس سال حج پر جا رہے تھے اور انہوں نے بیٹی کو نانے کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

حاجی نواسی کو لے کر بازار سے گزر رہا تھا اور جبار خان قریب ہی نال کے چبوترے پر بیٹھا چرس بھرے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس دھواں دھار ماحول میں ایک واہیات سے خیال نے پہلو بدلا۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت تھی۔ حاجی واصف علی کی درد والی جگہ اس نے ڈھونڈ لی تھی۔ کسی شریف آدمی کی عزت کا شیشہ ٹوٹ جائے تو اس کی موت ہو جاتی ہے۔

مگر بڑھاپے میں طبعی موت سے پہلے ایک اور طبعی موت سے گزرنا پڑے تو کیسا لگتا ہے؟ اب تک حاجی واصف علی کی کمر جھکی نہ تھی۔ داڑھی لمبی ہو گئی تھی۔ مگر چہرے پر اطمینان کا نور تھا اور یہ نور جبار خان چھین لینا چاہتا تھا۔ جبار خان کو چھین لینے کی عادت تھی۔ پتہ نہیں دس بارہ سال کس طرح اس نے حاجی اصف علی کی بزرگی کو تسلیم کئے رکھا۔ اور پھر اگر وہ حاجی واصف علی کی کچی کلی کو مسل کر سرحد پار کر لے گا تو کون اسے تلاش کر سکے گا۔ وہاں تو حاجی کی روح بھی اس کا پیچھا نہ کر سکے گی۔ حاجی صاحب کو زندگی بھر یہ یاد رہے گا کہ کیسے دوست کو دشمن بنایا جاتا ہے؟ پورے ایک دن کے بعد اسے یہ رات نصیب ہوئی تھی۔ حاجی صاحب کسی عزیز کی وفات پر کوئٹے گئے ہوئے تھے۔ گھر میں اماں اور اس کی نواسی تھی۔ ایک نوکرانی کام کرتی تھی اور ایک چوکیدار تھا جس کی چلم میں شام سے ہی جبار خان نے نشے کی دوا ملوا دی تھی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں سویا اور اٹھ نہ سکا۔ بوڑھی نوکرانی کھانا کھا کے شام ہوتے ہی چلی گئی تھی۔

حاجی صاحب اب تک اپنے اس پرانے اندرون شہر والے مکان میں رہتے تھے۔ اس کے چوبارے کے نیچے دکانیں تھیں۔ کم بخت دکانیں بھی بارہ ایک بجے رات بند ہوئیں۔ دو بجے گلی میں بالکل اندھیرا ہو گیا تھا اور جبار خان کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر آ گیا۔ جبی اماں تین بجے تہجد کے لئے اٹھی تھی لیکن اس شور سے پہلے اٹھ گئی اور گھبرا کے بولی "کون ہے......کون ہے؟" اللہ ڈتہ اللہ ڈتہ" انہوں نے چوکیدار کو آواز دی' کوئی آواز نہ آئی تو بولی۔ "کیا حاجی جی آ گئے ہیں؟"

اس وقت جبار خان نزدیک آ گیا تھا۔ غسل خانے کا ہلکا سبز بلب جل رہا تھا۔ لیکن جبار خان نے اپنے چہرے کو کپڑے سے چھپایا ہوا تھا۔ اگر وہ اپنے آپ کو نہ بھی چھپاتا تب بھی جبی اماں اسے ٹھیک طرح سے نہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کی بصارت گنوا چکی تھی۔ جبار خان نے اس کے نزدیک پہنچ کر اپنی کھڑی ہتھیلی اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ احتیاطاً جبار خان نے اسے اس کے دوپٹے کے ساتھ باندھ دیا۔ ساتھ والے پلنگ پر وہ معصوم سوئی ہوئی تھی۔ اور اس نے اس معصوم کو خباثت سے دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی بھاگنے کے لئے' لیکن یہ جھونکا کیسا تھا؟ شاید اس کھلی کھڑکی میں سے آیا تھا۔

عجیب سی خوشبو تھی۔ اس کے نتھنوں سے گزر کر گریبان سے الجھ گئی تھی۔ "جلدی کر خان" اس نے اپنے آپ سے کہا اس نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کے زور کو اس نے لڑکی کے ہونٹوں پر سخت کر دیا۔ تاکہ اگر کوئی آواز بھی نکلے تو اس کی ہتھیلی کو توڑ کر باہر نہ آ سکے۔ پھر یکدم کچھ ہلکی سی نامعلوم سی آواز آئی۔ اس نے ہوشیار ہو کر کھڑکی کے باہر گلی میں دیکھا۔ گلی میں اندھیرا تھا اور روزانہ کی طرح خاموشی۔ بہت دور کمیٹی کا ہلکا زرد بلب روشن تھا۔ مگر یہ روشنی راستہ دینے کے لئے کافی نہ تھی۔ کوئی آہٹ نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی آ رہا ہے۔ انجان سی آہٹ اس کی طرف آ رہی تھی۔ آوازوں کا ایک ریلا آیا۔ آوازیں تو زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔ جہاں کوئی انسانی آواز جاگ اٹھتی ہے وہاں تو دھرتی کا دل بھی دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ مگر یہ بھن بھن کیسی تھی؟ آوازیں تھیں تو زندگی کی علامت کیوں نہ بنی تھیں؟ جس طرح کسی جگہ بہت ساری اکٹھی مکھیوں کو یکدم

اڑادیا جائے تو ایک نامعلوم سی بھن بھن فضا میں بکھر جاتی ہے۔ مگر اس تاثر کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

''جلدی کر خان''...... اس نے اپنے اندر ہلچل محسوس کی۔ صرف تیرا وہم ہے۔ اس لئے میں نے تجھے کہا تھا۔ دو چار سگریٹ اور پی لے۔ تیرے دل نے تجھے بزدل بنا دیا ہے۔ جبار خان کو طیش آ گیا اور طیش سے اس کے اندر کا شیطان بھڑک اٹھا۔ یہ شیطان اس نے خود بھڑکایا ہوا تھا۔ نفس کا شیطان شعلے کی طرح بھڑک اٹھے تو آدمی کے ضمیر کی آوازیں ایک لمحے میں سرد ہو جاتی ہیں۔ اس لمحے کو پار کرنے کے لئے درندہ بن جانے کی ضرورت تھی۔ اور درندوں کے پاس دل اور دماغ نہیں ہوتے۔ درندگی اور انسانیت میں ایک انچ کا فاصلہ تھا کہ آواز آئی۔ ''کلمہ شہادت'' اور پھر کچھ آوازیں ابھریں ''اشہدان لا الہ الا اللہ واشہدان محمد الرسول اللہ'' کلمہ شہادت اونچی آواز میں پڑھا گیا۔ اور قدموں کی آوازیں قریب ہوتی گئیں۔ جبار خان کانپ کر پیچھے ہو گیا۔ شاید گلی سے کوئی جنازہ گزر رہا تھا۔ کافوری خوشبو کا ایک جھونکا کھڑکی سے اندر آ گھسا۔ اس کے ساتھ ہی موتئے اور گلاب کی اداس اداس خوشبو بھی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ پہلا جھونکا کونسی خوشبو کا تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ جنازہ کھڑکی کے پاس سے گزر گیا۔ کھڑکی کے قریب پھر کسی نے کہا ''کلمہ شہادت'' اور پھر کندھا بدل گیا تھا۔ بہت سے لوگ تھے۔ ایک گیس لیمپ تھا۔ قدموں کی آوازیں دیر تک آتی رہیں۔ سب چپ تھے سب تھکے ہوئے تھے۔ اور آخری سفر بھی کتنا عجیب ہوتا ہے؟ ہر گنہگار اس سفر سے آنکھیں بند رکھتا ہے۔ مگر یہ سونے والوں کو برابر کہتا رہتا ہے۔ اٹھو کچھ کر لو۔ ابھی عمر ہے۔ ورنہ خاک کا بستر ہوگا۔ اور اب بھی کچھ دن اپنے سرہانے بیٹھ کر آنسو بہالو۔ اگر دنیا میں اپنی خوشبو چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو اٹھو۔ راتیں شب بیداروں کے ساتھ گزارو۔ اور اگر عبادت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تو انسانیت کا بوجھ اٹھا لو۔ تم صرف اتنا کرو کہ اپنے بھائی بندوں کے آنسو پونچھو۔ انسانوں کی بھلائی اور فلاح کے لئے اچھے کام کرو۔ اپنے رات دن میں سے کچھ حصہ بندوں کو دو۔ اپنی دولت میں سے تھوڑا سا غریبوں اور یتیموں کو دو اور اگر کچھ بھی نہیں کر سکتے تو پھر انسانیت کو دکھ نہ دو۔ انسانوں کے جسم پر نظر نہ آنے والے نشان نہ لگاؤ کہ اپنی مخلوق پر ظلم کرنے

والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ معاف نہیں کرتا۔

جبار خان گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا اس نے منہ باہر نکال کر دیکھا۔ جنازہ کافی دور نکل گیا تھا۔ خوشبو اس کے پیچھے پیچھے بکھری ہوئی تھی۔ صرف اس گیس کی مدھم سی روشنی ایک نقطے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ کھڑے کھڑے جبار خان کو محسوس ہوا جیسے وہ خود لوگوں کے کندھے پر سوار ہو اور اپنی آخری منزل پر جا رہا ہو اور لوگ اسے اندھیری قبر میں اتار کے بھاگ آئے ہوں۔ جبار خان کو جھر جھری آ گئی۔

ایک دن تو ایسے ہونا ہی ہے...... ''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ''

دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ اسے مسجد کے مولوی صاحب کا وعظ یاد آیا۔ ''تیرے پاس کیا ہے جبار خان؟ جس وقت فرشتے آئے تو تو کیا کہے گا؟ تو نے تو جمعے کے علاوہ کبھی کوئی نماز بھی نہیں پڑھی۔ کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ تجھے تو ہمیشہ لوگوں نے خلق خدا کو ستانے کے لئے استعمال کیا ہے'' جبار خان کو یوں لگا جیسے اس کی جان ٹانگوں میں سے نکل رہی ہے اور وہ یہیں گر جائے گا۔ مر جائے گا اور کوئی اس کی بخشش کی دعا بھی نہیں کرے گا۔ وہ ایک انتہائی خبیث فعل کے لئے یہاں آیا تھا۔ ''نہیں'' اس نے کھڑکی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں کون ہوتا ہوں؟ میں کون ہوتا ہوں؟ جبکہ آسمان پر جو خدا ہے وہ حاکم ہے۔ وہ قادر ہے۔ وہ عادل ہے۔ یہ لڑکی میری بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ میری ماں بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے کھڑکی کی کنڈی کھول دی اور کوٹھے کی بتی جلا دی۔ نازک سی لڑکی ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئی تھی۔ جمی اماں کے اس نے ہاتھ پاؤں کھول دیئے اور اسے بستر پر سیدھا کر کے لٹا دیا۔ کوٹھے کی بتی جلنے دی۔ باہر والا دروازہ کھول کر وہ گلی میں آیا۔ جنازے کی بتی آسمان پر ایک ننھے تارے کی طرح مدھم نظر آ رہی تھی۔ کافوری خوشبو حیران و ششدر گلی میں ٹھہری اس کے فیصلے کی منتظر تھی۔

جبار خان نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور پھر گڑ گڑا کر بولا۔ ''خداوندا'' مجھے صرف اس لئے بخش دے کہ آج میں جس ارادے سے آیا تھا اس پر عمل کرنے سے مجھے تیرے نام کی پکار نے روک دیا۔ پھر وہ خوشبو کا ہاتھ پکڑ کر جنازے میں شامل ہونے کے لئے تیز تیز دوڑ پڑا۔

حامد نعیم

ننگی آنکھ اور نیلا کیمرہ

چھوٹا سا ایک کمرہ ہے..... چاروں طرف دیواروں پر نیلا رنگ کیا ہوا ہے..... ہر طرف سامان بکھرا پڑا ہے..... شاید یہاں سے کوئی جانے والا ہے..... دو آدمی سامان باندھ رہے ہیں..... ایک کھول رہا ہے..... بہت سی تصویریں ہیں..... پوری..... کٹی پھٹی..... ادھوری..... اور کچھ تصویروں پر دوسرے نقش ابھر رہے ہیں..... چمک رہے ہیں..... ہوں..... تصویریں اٹھانی اور اکٹھی کرنی شروع کر دیں..... ایک..... دو..... تین..... چار..... چار کیسے ہو گئیں..... عدد تو ہمیشہ طاق رہتے ہیں..... جفت کیسے ہوئیں..... جفت ہو کے اپنا آپ ختم کر بیٹھتے ہیں..... الگ الگ..... دکھ سکھ..... تصویریں سیاہ سفید..... پیلی اور نیلی..... نیلی..... خواب بھی نیلے..... آنکھ بھی نیلی..... کمرہ بھی نیلا..... سامان باندھنے والے..... سفید کالے..... کھولنے والے نیلے یہ کیا ہے؟..... نیلی..... بالکل نیلی تصویر..... میں اسے سب سے نیچے لگا دوں..... کوئی دیکھ نہ لے..... سنا ہے ہوی آنکھ نیلی ہوتی ہے..... جو ننگی ہو..... سچ ہے جھوٹ..... اگر جھوٹ بھی ہوا تو کیا؟..... بہت سی جھوٹی باتیں سچ لگتی ہیں..... اور بہت سی سچی باتیں جھوٹی..... پتہ ہے کیا کہانی ہے؟..... ہر بندہ..... ہر پنچھی..... اور ہر پر کہانی ہوتا ہے..... آگے آنے والی چیزوں کے پیچھے بھی..... اور پیچھے جانے والی چیزوں کے آگے بھی ایک شے ہے..... کہانی..... بہت سی باتیں..... ان دیکھی..... ان سنی ہوتی ہیں..... یہ بھی کہانی..... کون سے کون دیکھے؟..... آنکھ سے..... آنکھ دیکھے..... دیکھنا بھی ایک فن ہے..... محو دیکھنے کو ترسیں آنکھیں..... گلے لگانے کو پھڑکیں بانہیں..... دیکھنا پھڑکنا تو وہی ہے..... جو دیکھنے والا دل رکھتا ہو..... اور ماتھے کے نیچے ننگی آنکھ روشن ہو..... حسن تو سارا اسی ننگی آنکھ میں ہے..... ورنہ گھپ اندھیرا..... آنکھ ننگی نہ ہو تو بھی کچھ ہوگا..... ٹامک ٹوئیاں ماریں..... اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا رلا دیتا ہے..... کچھ لوگ

اجالے میں الٹا آنکھیں بند کر کے ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں..... تصویر دیکھو..... ٹامک ٹوئیاں نہ ماریں گے تو کیا کریں گے..... سامان کیوں نہیں باندھا جا رہا؟..... دروازہ کھلتا ہے..... باندھنا..... کھولنا..... دیکھنے والے پھر ادھر دیکھیں..... کررررڑ..... کر.....رڑ پاؤں تلے کیا ہے؟..... شپ.....

''نہ نہ..... سینہ چھین؟''

''یہ تصویر کہاں سے آئی ہے؟'' آنے والے نے سوال کیا۔

''کہاں سے آئی ہے''؟ اس نے سوال پر سوال کیا۔

''سوال کا مطلب سوال ہوتا ہے''؟ آنے والے نے پھر سوال کیا۔

''ہاں..... بہت سے سوالوں کا جواب ایک اور سوال ہوتا ہے''..... اس نے جواب دیا۔

''ہوگا..... خیر یہ بتا یہ کہاں سے آئی ہے؟''

''یہیں پڑی تھی''

''اور کیا ہوتا ہے یہاں..... نیلے کمرے میں نیلی تصویر نہ ہوگی تو کیا ہوگا؟''

''پھر سوال کیوں کرتا ہے؟''..... اس نے قہقہہ لگایا..... دو جائیں..... ایک آئے کالے چلے جائیں..... نیلا آئے''۔

''نیلا کیوں''؟

''دھرتی کا رنگ جو ہے''

''دھرتی کا رنگ نیلا ہوتا ہے؟'' آنے والا ہنسا۔

تو آنے والا نہیں..... جانے والا ہے..... کودن..... دھرتی کا رنگ نیلا ہے۔

''سارے رنگ گہرے ہو کر نیلے ہو جاتے ہیں''..... اس نے جواب دیا۔

''تو بدتمیز ہو گیا ہے''..... ''اچھا''..... اس کی آنکھیں ماتھے پر آ گئیں..... جواب پاتا ہوں..... جو کچھ سوچتا ہوں وہی کہتا ہوں..... منافقت کوئی نہیں..... اچھا چھوڑ..... اچھا بن.....

تصویر پھاڑ دے"......

"کیوں"؟

"پھر دے دے"

"کس کو"؟

"جس کی تصویر ہے"......

"یہی تو سوال ہے......تصویر کس کی ہے؟" اس نے ہنس کر پوچھا......

کسی کی تو ہوگی......بھلے مانس......آ ؤ باہر چلیں۔

"تو جا......میں یہیں ٹھیک ہوں......"

"یہاں حبس ہے......گرمی ہے......مر جائے گا"

"نہیں مرتا......تو جا......حبس و گرمی کوئی شے نہیں...... مجھ کو مرنے کا ڈر تجھے ہوگا......

یہاں موت ہنستی ہوئی گھر کے اندر آ جاتی ہے"

"موت ہنستی ہے؟ کون!"

"میں نہیں موت کون ہے......ہنستی جو آ جاتی ہے......"

میں روٹھ جاؤں گا......ناراض ہو جاؤں گا......"

"بہت سے روٹھ کر مان جاتے ہیں......بہت سارے مان کر روٹھ جاتے ہیں"

"کونسی بات سچی ہے"؟

"جو نیلی ہو"......وہ ہنسا

"تجھے ہر بات نیلی لگتی ہے......اجالے میں بھی دیکھا کر"

"اگر میں اندھیر میں آنکھ ننگی کروں......پھر"؟

میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ پہلے میری کوئی بات مانی ہے؟

ماننے والی باتیں تو بہت سی ہیں......ماننے کو دل نہیں مانتا"......

"اچھا دیکھ سامان باندھنے والے چلے گئے ہیں"

بس اب تو جا......میں سامان کھولتا ہوں......دیواروں پر کیلنڈر ٹانگتا ہوں...... یہ کیلنڈر سفید چٹے کاغذ ہیں......آنکھ ننگی کر تصویر دیکھ لے"

"پھر وہی مصیبت......" اس نے غصے سے دروازہ بند کیا اور باہر چل پڑا...... جان چھٹی......کیلنڈر ٹانگیں......دیواروں پر کیل ٹھونکیں......ٹھک ٹھک......ٹھک......دیوار پر......دیوار......اوپر چھت......پنکھا چلتا ہے......خالی حبس......حبس......لفظ جلتا ہے......بٹن......بٹن کھولیں......نہ......قمیص اتاریں......بنیان اتاریں......بستر کھولیں......سوئیں......نیند ادھار دی تھی......پھر نہیں دی......اچھا کب تک سانپ پالے گا......ڈنک مارے گا...... منہ میں شہد گھلا......ہونٹ کا نچلے کا نچے مسکرائے......ٹانگیں پھیلائیں سگریٹ کا ایک کش لیں......بازو سر کے نیچے......سر کی طرف......گھپ اندھیرا......ننگی آنکھ سے نیلی چھت دیکھیں......دیوار......دیوار دیکھیں......سفید چٹے...... نیلے کیلنڈر دیکھیں......کیلنڈر کے پیچھے ایک اور کیلنڈر پھر دیوار......دیوار سے آگے......پھول......باغ بہاریں......خوشبوئیں......حسن کا نقطہ روشن ہے......خوشبو پھیلتی ہے......سانس کی خوشبو......جیسے......گرمی والی حبس والی آدھی رات کو ٹھنڈے پانی کی پھوار ہے۔

سجاد حیدر پرویز

اجالا اندھیری رات کا

میں کون ہوں؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ جواب نہ آیا تو پھر میں نے پوچھا کہ میں کیا ہوں؟ اس بار جو جواب ملا وہ میرے کانوں تک نہ پہنچا۔ اور میں زندگی کے شور میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔ سوچا کہ آخر میرا کیا بنے گا؟ کیا میں ایسے ہی آوازیں دیتا رہوں گا۔ میں ایسے ہی اندھیری رات کا مسافر بنا رہوں گا۔ مجھے کوئی اجالے میں نہ لائے گا۔ مجھے بالکل پتہ نہ چلے گا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟

میرے بہتے آنسوؤں نے میرے اردگرد سوچوں کا دریا بنا دیا۔ اس کیفیت میں نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ اور پھر میری آنکھوں نے دیکھا کہ روشنیاں میرے وجود میں سے نکل کر ہر طرف چل پڑیں اور مجھے پتہ نہ چل سکا کہ آخر یہ روشنیاں کہاں گئیں۔ اور پھر میں نے سوچا کہ آخر میں یہاں کب تک بیٹھا رہوں گا۔ یہ روشنیاں کس وقت واپس آئیں گی۔ میرے سوچنے کی دیر تھی کہ ایک زنانہ آواز آئی...... ''بھائی فکر نہ کرو...... تیری روشنیاں جلد واپس آ جائیں گی''۔

''مگر تو...... تو ہے کون؟...... مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا''...... ''ہاں...... تجھے میں کیسے نظر آ سکتی ہوں؟ لیکن سن میں تجھے دیکھ رہی ہوں'' ''تو مجھے دیکھ رہی ہے؟...... بتا میں کون ہوں؟ اور کیا ہوں؟''

''تو اجالا ہے''...... ''میں اجالا ہوں''...... ''ہا ہا...... تو اجالا ہے اور میں اندھیری رات...... مجھے تیری ضرورت رہتی ہے اور اب بھی تیری روشنیاں تیرے وجود سے نکل کر میرے وجود میں آ گئی ہیں''...... ''مگر کیوں؟''...... ''مجھے ان کی ضرورت ہے'' ''تجھے ان کی ضرورت ہے یا نہیں...... میں نہیں جانتا۔ مجھے میری روشنیاں واپس کر دے۔ ورنہ''...... ''ورنہ تو کیا کر لے گا؟''

......''میں تجھے پکڑ کر تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ نہ تو ہو گی اور نہ میری روشنیاں مجھ سے جدا ہوں گی۔ تجھے کیا خبر کہ میں روشنیوں کے بغیر کتنا بے سکون ہوں'' ''تو بڑا خود غرض ہے''...... ''وہ کیسے؟'' ''اپنے سکون کی خاطر میرا گلا گھونٹ دے گا۔ یہ بھی نہ سوچے گا کہ میں جس پر وقت آ پڑا ہے اور جو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھر رہی ہے اور دھکے کھا رہی ہے۔ میں جوان روشنیوں کے بغیر بالکل مر جاؤں گی۔ ایک لمحہ بھی نہ جی سکوں گی۔

مجھ سے روشنیاں چھین لے گا؟

''چھینوں گا نہ تو کیا میں تجھے بخش دوں گا؟ کیوں بھئی مجھے آخر تجھ سے کیا مفاد ہے؟''

''بھائی! ہر وقت اپنے مفاد کو نہیں دیکھا جاتا۔ دیکھ آج تو میرے کام آ جا۔ ہو سکتا ہے کل میں تیرے کام آ جاؤں''

''جا جا...... زیادہ بات نہ کر...... یہ نہیں ہو سکتا۔''

ہاہ...... بڑا ظالم تھا۔ آخر چلا گیا تو اپنی روشنیاں بھی ساتھ لے گیا۔ اچھا خیر یہ شام کو لوٹے گا تو اس کی ساری روشنیاں میں لے لوں گی...... ہاہاہ...... رب سوہنے نے بھی کیا ستم کیا ہے...... مجھے اندھیری رات بنا دیا ہے۔ میں بھی اجالا ہوتی تو کیسی اچھی بات ہوتی۔ مجھے تو کوئی دیکھ نہیں سکتا.................. پتہ نہیں کہ میں کیسی لگتی ہوں گی؟...... اجالا کتنا خوبصورت ہے۔ سفید سفید دودھ جیسا۔ روشن روشن آنکھیں ہائے۔ اور جس وقت اس میں سے روشنیاں نکل رہی ہوتی ہیں۔ رب سوہنا!...... کتنا اچھا ہوتا۔ اگر مجھے بھی اجالا بنا دیتا''...... ''تو اجالا تو نہیں بن سکتی لڑکی.................. مگر تجھے اجالے کی روشنیاں ضرور مل سکتی ہیں۔'' ''تم کون ہو؟''...... مجھے سورج بادشاہ کہتے ہیں...... تمہارے ساتھ یہ گول گول منہ اور سونے کے رنگ والا کون ہے؟...... یہ...... ہاہاہا...... یہ میرا چھوٹا بھائی...... چندا ماموں ہے......''مگر تم کیا کہہ رہے تھے؟''...... یہی کہ تجھے اجالے روشنیاں مکمل کر سکتی ہیں۔ کیوں کہ تو میری بیٹی زمین کی مہمان ہے اور مہمان کی خواہش کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔''

''لیکن سورج بادشاہ! تم نہیں جانتے اجالا بہت ضدی ہے۔ میں نے اس کے آگے بہت منت زاری کی ہے ہاتھ بھی باندھے ہیں مگر اس نے میری ایک نہیں مانی اور صبح ہوتے ہی چلا گیا ہے۔ وہ بھلا مجھے اپنی روشنیاں کیسے دے گا''؟

''وہ نہ دے گا تو ہم تجھے روشنیاں دے دیں گے۔ گھبرا نہیں۔ ہم جو کہتے ہیں پورا کرتے ہیں۔ شاید تجھے پتہ نہیں۔ اجالا میرا اور میرے بھائی چاند کا مشترکہ دوست ہے۔ دن کو وہ میری خدمت کرتا ہے اور رات کو میرے بھائی کی۔ آئندہ ہم اس کی روشنیاں لے کر تجھے دے دیں گے۔ کیا سمجھی؟''

''سمجھ گئی ہوں...... سورج بادشاہ سائیں! دن کو تم مجھے اجالے سے روشنیاں لے دو گے اور رات کو چندا ماموں۔''

''ہاں...... لڑکی...... ہاں...... چاند بھائی! یاد رکھنا کہ آج سے اجالا اندھیری رات کا ہوگا۔''

''ہا...... ہا...... کیا وقت تھا جب نہ مجھ کو یہ پتہ تھا کہ میں کون ہوں اور میری کرنیں بھی میرے اپنے پاس ہوتی تھیں۔ مزے کی گزر رہی تھی۔ کم بخت جب سے اندھیری رات ملی ہے سکون اور آرام تباہ ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کس کی نظر لگ گئی؟''۔ ''تجھے کسی کی نظر نہیں لگی بھائی تو نے اپنے آپ ہی یہ مصیبت مول لی ہے۔''وہ کیسے؟'' ''تو کہتا تھا کہ ساری روشنیوں کا میں اکیلا مالک بنوں اور کسی غریب مسکین کو بالکل کچھ بھی نہ ملے۔ رب سوہنے نے تجھے تیرے لالچ کی سزا دی ہے کہ تیری ساری روشنیاں چھن گئی ہیں۔ میں بچاری جوان روشنیوں کے لئے ترستی تھی۔ آج اکیلی ان کی مالک ہوں۔ کیا سمجھے۔ مگر میں تیری طرح کنجوس نہیں جو اکیلی ان ساری روشنیوں کو اپنے پاس لئے بیٹھی رہوں۔ میں تجھے دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ لے آدھی روشنیاں لے لے میں یہی سوچوں گی کہ مجھے آدھی روشنیاں ملی تھیں۔''

''بہن! تیرا کس طرح شکریہ ادا کروں؟ کہ تو نے مجھے تڑپ تڑپ کر مرنے سے بچا لیا

ہے۔ اگرچہ میں نے تجھ سے برا سلوک کیا لیکن تو نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے کہ مجھے ساری عمر کے لئے خرید لیا ہے۔''

''تجھے یاد ہوگا اجالے بھائی! کبھی میں نے تجھے کہا تھا ہو سکتا ہے میں کبھی تیرے کام آؤں۔ دیکھا نا تو نے میری بات نہ مانی تھی لیکن رب سوہنے نے میرے منہ سے نکلی بات پوری کر دی۔''

''بس بہن...... بس...... اب مجھے مزید شرمسار نہ کر...... میں اپنی غلطیاں مانتا ہوں۔ تو نے مجھے جو یہ آدھی روشنیاں دی ہیں...... سائیں چاند ماموں کو کہہ کر میں یہ ہر رات تیری جھولی میں آ ڈالوں گا۔ تاروں کو کہہ کر تجھ تک اپنا پیار ضرور پہنچاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اور اب لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ روشنیاں تو روشنیاں اجالا بھی اندھیری رات کا ہے۔

آخر تک پہنچانے والے

ایک مخلوق تھی خدا کی ......غرض مند دکھی اور امید وار......مگر ابھی مخدوم زادہ صاحب جاگے ہی نہیں تھے۔ مخدوم صاحب قبلہ کی ہدایت کے مطابق پرانے نوکروں نے مخدوم زادہ صاحب کی تہجد گزاری اور نماز فجر کے ساتھ قرآن پاک کے ختم اور لاکھ درود کی روزانہ نورانی ریاضت کا ذکر یوں پھیلا دیا تھا کہ وہ اس غرض مند دکھی اور امیدوار مخلوق کی تقدیر کی لوح محفوظ پر نقش ہو گیا تھا۔ جیسے یہ بات کہ مالک کی رضا یہی ہے۔ ایک مخدوم ہوں اور دوسرے خادم۔ جو اپنی محنتیں کھیتیاں......اولاد......رزق اور زندگی گدی کے لئے وقف رکھیں اور سمجھیں......اچانک دانتوں کے بغیر ایک آواز......التجا......دہشت اور شکوے میں غوطے کھا کے ابھری...... مجھے پہنچاؤ؟ تھوڑی دیر کھسر پھسر......تھوڑی بہت کھی کھی کھی ہوئی...... پھر ایک مذاق بھری آواز آئی......پہنچا کیوں نہیں بھائی اللہ بخش؟ تمہارے باپ کے بنائے ہوئے بنچوں پر تو بیٹھے ہیں۔ اللہ بخش اس کے ہاتھ میں بڑی صفائی تھی۔ ایک نے ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے اسی طرح کے ایک اور آدمی کے کان میں بات کی۔ کہ ایک ایک لفظ سنا گیا......"سکینہ کا باپ اللہ بخش......جس نے کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی"......مگر مجھے مخدوم صاحب نہیں پہنچا تے......وہ روز حشر میرے واقف کیسے بنیں گے؟ پھر التجا......دہشت اور شکوے میں ڈوبی ہوئی لتھڑی ہوئی آواز آئی...... عین اس وقت میلی آنکھوں والا شیخ اپنی ٹوپی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر چیل کی طرح اللہ بخش پر جھپٹا...... اوئے حشر کے کچھ لگتے......گردن سے پکڑ کر اس نے اسے پاؤں کی طرف دھکا دیا......"اب تو یہاں آیا......تو تجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے"......پولیس؟......وہ وردی والی......کنویں میں تو جھانکتی نہیں......اللہ بخش تو کنویں میں رہتا ہے......"پھر پکار کر کہنے لگا......مخدوم صاحب کو کہو ہمیں آخر تک پہنچائیں......ہم نے ان کا دامن پکڑا ہے"......

میلی آنکھ والا شیخ اللہ بخش کو آخر تک چھوڑ آیا تھا اور واپس آیا تو سانس پھولا ہوا تھا...... ایک دو نے اس سے پوچھا......"مخدوم زادہ صاحب"؟ اس نے ہاتھ جھٹکے......ایک الماری کا تالہ کھولا......صراحی میں سے ٹھنڈا پانی پیا......پھر تالا لگا دیا......تو اس کی نظر میرے ساتھ بیٹھے ریاض پر پڑی......دونوں کے درمیان یونہی علیک سلیک ہوئی......ایک غرض منداور امیدوار نے دستی پنکھا جھلنا شروع کیا......اب شیخ کی ہر حرکت مخلوق خدا کی بھوکی اور پیاسی نظروں کا مرکز بن گئی...... البتہ لوگ آنکھوں کو ستانے کے لئے کبھی کبھی ریاض کو بھی دیکھ لیتے تھے...... میں بہت تنگ ہوا بیٹھا تھا...... یہ بات نہیں کہ میں کوئی وہابی ہوں......بس انسان کی تذلیل اس کے ہاتھوں نہیں دیکھی جاتی......یا ممکن ہے مجھے کوئی احساس کمتری ہو......جو ایک مصنوعی احساس برتری پیدا کر لیتا ہے......میں نے سوچا......ریاض نے جس وقت اپنی گاڑی اس طرف موڑی تھی......تو مجھے اسی وقت کھٹک گیا تھا......کہ وہ مخدوم صاحب کے آستانے پر جا رہا ہے......ریاض میرے اضطراب کو پڑھ کر مسکرایا اور کہنے لگا...... بھائی صاحب! مارشل لاء کے خلاف پمفلٹ لکھنا آسان ہے......ہم خیال دوستوں میں جمہوریت کے حق میں تقریریں کرنا آسان ہے شرف آدمیت کی بحالی کے خواب شاگردوں کو دکھانے بھی آسان ہیں......مگر یہ زندگی......درمیانے طبقے کے آدمی کی زندگی گزارنا بہت مشکل ہے......بچے کا داخلہ......اپنا تبادلہ، ترقی...... ہاؤس بلڈنگ کا قرضہ...... گیس......بجلی کا کنکشن......ٹوٹی ہوئی گلی......نالی، سڑک کی مرمت......حاسد اور منافق کی سازش کے مقدمے کے چالان، غرض زندگی کی اس گاڑی کا پٹرول کسی نہ کسی مخدوم یا مخدوم زادے کے آستانے کی حاضری کا طلبگار ہے......میں نے اپنے ایک دو شاگردوں اور دوستوں کی اقتدار کے ساتھ دوستی کو یاد کیا اور ریاض کو کہا......یار کم از کم اب ہم اتنے بے بس بھی نہیں......"کیا پوچھتے ہو......بابا...... سسٹم کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا......تو نے الیکشنوں سے پہلے مخدوم صاحب کو خاندان سمیت کنویسنگ کرتے نہیں دیکھا؟ جنہوں نے انہیں یہ کرنے کا اشارہ دیا تھا ان کے ملازم تھے......یہ سارے اب تمہیں اقتدار میں نظر آتے ہیں......"میں تمہاری اور تمہارے اخبار کی ڈس

انفارمیشن مہم سے واقف ہوں ...... تمہارے چیف ایڈیٹر کی کرتوتوں اور نا ٹوں کی جھلک بھی دیکھ چکا ہوں ...... اس لئے تمہاری باتیں میرے آئیڈیلزم کو توڑ نہیں سکتیں ...... ریسٹ ایشور ...... ٹیک اٹ ایزی اولڈ بوائے ...... یاد ہے تمہارے ایک شاگرد کی کمر پر استری کی تھی مارشل لا کی ایک حامی تنظیم کے لیڈروں نے ...... تو تم گئے تھے بڑے زعم کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس ...... جو پوز کرتا تھا کہ وہ ایک ترقی پسند شاعر اور دانشور ہے کیا کہا تھا اس نے تمہیں؟ عجیب طرح کی ہنسی ہنستے ہوئے ریاض نے مجھ سے پوچھا ...... کیا تھا بھلا؟ جسٹ ریلکس اینڈ انجوائے ...... میری جان! یہ سسٹم تمہارے ساتھ یہی کرتا رہے گا ...... بچوں کو اس سے بچانا چاہتے ہو تو آڑھتی بنو ...... کمیشن ایجنٹ بنو ...... اپنے بچوں کو غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ اور لمس میں پڑھاؤ ...... ایک لاکھ بیس ہزار سال کی فیس دو ...... اور پھر بچوں کو باہر نکالو ...... اس کے بعد چاہے پاکستان کا یوم آزادی چھ چھ جھنڈے لگا کر مناؤ ...... چراغاں کرو ...... تقریریں کرو ...... ٹی وی ڈرامے لکھو ...... قومی نغمے لکھو ...... پاکستان اسٹڈیز کی نصابی کتابیں لکھو ...... بابا جسٹ ریلکس اینڈ انجوائے ......"

میلی آنکھوں والے شیخ نے ریاض کو اشارہ کیا برآمدے کی طرف آنے کا ...... ریاض نے مجھے بھی ساتھ لیا اور اس برآمدے میں پہنچ گیا ...... جہاں لوگ جوتوں کے بغیر آتے تھے ...... شیخ صاحب نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا ...... مخدوم زادہ صاحب کا گیارہ بجے مخدوم رشید میں جلسہ ہے ...... آپ فرمائیں کیسے آنا ہوا؟ میں پیغام ان تک پہنچا دوں گا اگر ان کے دستخطوں والے رقعے چاہئیں تو ......" ریاض نے اس پیشکش کو ہاتھ کے اشارے سے جھٹک دیا ...... بس مخدوم صاحب نے پرسوں جہاز میں مجھے کہا تھا کہ ملاقات ہونی چاہئے" ...... اچانک ایک پجیرو زوں کرکے صحن میں داخل ہوئی تو مجمع میں ہلچل مچ گئی ...... شیخ نے سب کو ٹشی کر کے چپ کرایا ...... ریاض بڑے اعتماد کے ساتھ پجیرو کے پاس جا کر مخدوم زادہ صاحب کے گن مین کے ساتھ بات چیت کرنے کھڑا ہو گیا ...... اتنی دیر میں مخدوم زادہ صاحب ایک دروازے میں سے بن سنور کر آئے اور تیزی سے پجیرو میں بیٹھ گئے ...... جو پہلے ہی سٹارٹ تھی ...... انہوں نے ریاض

سے ہاتھ ملائے بغیر مسکرا کر کہا ...... کل شام سات بجے ...... میرے دوسرے گھر ......" ریاض نے پتہ نہیں کیا بڑبڑ کی ...... مجھے یوں سنائی دیا جیسے کہہ رہا ہو ...... میں تو تمہارے ساتویں گھر بھی پہنچوں گا ......"

اس روز میری نظروں کو دھوکہ سا ہوا کہ مخدوم زادہ کے ساتھ جو شخص پجیرو پر چڑھا تھا ...... وہ جعفر تھا ...... جو مجھ سے چھٹی سے دسویں تک پڑھا تھا ...... اس کی شکل صورت اور وضع قطع بدل گئی تھی ...... لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس روز جعفر ہی ان کے ساتھ تھا جس روز ریاض مجھے ان کے آستانے پر لے گیا تھا ...... اس کے ایک مہینے بعد میں نے اخبار میں شیخ بیچارے کی موت کی خبر پڑھی ...... غسال نے یقیناً اس کی آنکھ کا میل بھی دھو دیا ہو گا ...... اس لئے اب میں اسے میلی آنکھ والا شیخ نہیں کہتا ...... اخبار میں تھا کہ مخدوم زادہ صاحب اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر نتھیا گلی سے اپنے شہر آ گئے ہیں ...... اور شیخ مرحوم کی قل خوانی میں شریک ہوں گے ...... قل خوانی سے اگلے دن مخدوم زادہ صاحب کی جو تصویر چھپی ان کے بائیں طرف مجھے پھر جعفر کی شکل نظر آئی ...... میں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا ...... خبیث ...... نالائق ...... مخدوموں کا چمچہ ......

باہر دروازہ کھڑکا ...... میری بیوی نے کہا ...... کوئی موا آیا کھڑا ہے ...... تمہارے شاگرد تمہیں تو خیر انسان نہیں سمجھتے ...... ہمیں بھی بندہ نہیں جانتے ...... مجال ہے جو ایک پل چین سے بیٹھنے دیں ...... میں تیس سال سے ایسے ہی احتجاجی مراسلے وصول کر کر کے کم از کم اپنی بیوی کے لئے اقوام متحدہ کا دفتر بن گیا ہوں ...... صابر اور خاموش ......

میں نے دروازہ کھولا تو جعفر تھا ...... نئی نویلی موٹر سائیکل پر آیا تھا ...... مجھے پاؤں کو ہاتھ لگا کے ملا ...... میں نے اوپر سے منع کیا ...... لیکن اندر سے مجھے کافی مزا آیا ...... میں نے کہا ...... نالائق ...... بارہ سال بعد شکل دکھائی ہے ...... وہ فخر اور بڑائی کی ہنسی ہنستا رہا ...... استاد جی! ایک مشورہ لینے حاضر ہوا ہوں ...... لیکن پہلے مجھے یہ بتائیے کہ کیا آپ کے علاقے کا کوئی والی وارث بھی ہے یا نہیں؟ گلی میں کھڈے ہیں ...... نالیاں ٹوٹی پڑی ہیں ...... بجلی کا ایک کھمبا ہے ...... وہ بھی

ٹیڑھا ہوا پڑا ہے...... مجھے ذرا اپنے محلے کے لوگوں سے ایک عرضی لکھوا کے دے دیں شاید میں آپ کے پڑھائے ہوئے کچھ لفظوں کا حق ادا کر سکوں ......

''اچھا اچھا...... یہ بھی ہو جائے گا...... حال سناؤ! آج کل کیا ہو رہا ہے''؟ ''اس روز میں نے آپ کو بجیرو کے اندر سے سلام بھی کیا تھا...... مگر آپ نے دیکھا نہیں...... میں مخدوم زادہ صاحب کی الیکشن کمپیں میں شامل تھا...... ان کے ساتھ ہی میں ہوتا ہوں...... آپ کے پاس اب مشورے کے لئے حاضر ہوا ہوں...... شیخ صاحب کی موت کے بعد مخدوم زادہ صاحب کہتے ہیں کہ ان کے آستانے کی منیجری میں سنبھال لوں...... میں نے اپنے ماں باپ سے بھی صلاح کی ہے اور تیسری ذات آپ کی ہے جن سے میں مشورہ لے رہا ہوں''

میں نے اپنی پچھلی تقریروں کے کچھ اقتباسات اس کے سامنے دہرائے پھر خلاصہ یہ نکلا کہ بیٹا! اگر یہ کام کیا تو رل جائے گا...... تمہارا سر چھوٹا ہے اور یہ پگڑی بڑی...... یہ پوسٹ کوئی گھاگ آدمی ہی سنبھال سکتا ہے جو یہ فن جانتا ہو کہ اپنا گھر بھی پورا کرے اور ان کا گھر بھی بھرے...... ان سے ٹھوکریں اور گالیاں کھا کر غرض مندوں سے سلام قبول کرے......

جعفر! یہ کام کیا تو کچھ عرصے بعد تیری شکل اور عقل بند ہو جائے گی...... بندے والے چلنے اور وضع میں رہ...... بیٹا! مخدوم صاحب اور مخدوم زادہ صاحب میں سرد اور بھائیوں میں گرم جنگ جاری ہے...... تم کسی نہ کسی کے غضب میں جل کر راکھ ہو جاؤ گے...... بیٹا! ان سے کوئی نوکری لو اور خدمت کرو اپنے ماں باپ کی...... بندے کو حرص نہیں کرنی چاہئے...... اپنے دائرے میں رہنا چاہئے...... اچانک میری بیوی ایک میلی سی چادر سر پر رکھ کر اندر آ گئی اور کہنے لگی...... بیٹا! ان کے کہنے میں نہ آنا...... ساری عمر انہوں نے ہمیں رلایا اور ستایا ہے...... تم بابا ان کا دامن پکڑو...... جو آخر تک پہنچانے والے ہیں...... دوسروں کی بیڑیوں میں بٹے ڈالنے والوں سے کیا صلاح لے رہے ہو؟''

طارق جامی

خانہ بدوش

''ہم سب آگ والے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ ہم آگ سے بچنے کے لئے جس راستے پر چلے تھے آگ اس کا انجام تھی۔''

میں نے دھیان دیا تو وہ میری بات غور سے سن رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ابھی یہ شخص مجھ سے کتنی گرمجوشی سے بغل گیر ہوا تھا۔ میں آج ہی بلکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے شہر پہنچا تھا۔ بس سے اترا تو پہلے یہی شخص ملا تھا۔ وہ میرا پرانا دوست ہی نہ تھا بلکہ میرا دیوار بہ دیوار ہمسایہ بھی تھا۔ مجھے اترتا دیکھ کر بھاگا آیا تھا۔ بڑی محبت سے حال احوال پوچھا تھا اور اب وہی شخص میری بات پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔

میں نے دکھ کی گٹھڑی کو کاندھے پر رکھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے بھائی' بہنیں' چچا' ماموں فوراً میرے گھر آ پہنچے۔ سب کو میرے گھر واپس آنے پر بے حد خوشی تھی۔ ہر شخص میرے گھر سے باہر رہنے پر دکھی تھا۔ میرے اٹیچی کیس، بستر اور تھیلے کو میری گھر والی نے بند کمرے میں رکھ دیا اور میں لوگوں کو کہانی شروع سے سنانے بیٹھ گیا۔

''سچ بات تو یہ ہے کہ آگ کا کسی کو پتہ ہی نہیں چلا' کوئی کہتا تھا گیس کے سلنڈر پھٹ گئے ہیں کسی کا خیال تھا کہ سگریٹ نے گھر پھونک دیا ہے' ہم بھی لوگوں کی بھیڑ میں چلتے گئے' اچانک افراتفری مچ گئی۔ آنے والے لوگ پیچھے کی طرف بھاگے اور جانے والے آگے'' وہ خوفناک اور مار دینے والا نظارہ میری آنکھوں میں اتر آیا۔ اور میں نے رو ہانسا ہو کر بات آگے بڑھائی۔ ''میرے بالکل سامنے ایک بوڑھی عورت خود اپنے مرد کو خیمے میں سے کھینچ رہی تھی۔'' میرے بڑے بھائی نے جمائی لی اور کہا ''اچھا باقی باتیں صبح کریں گے اور اس کی نظر کمرے کے

چاروں طرف گھوم گئی جیسے کسی شے کو تلاش کر رہی ہو۔ میں یہ بات نہ سمجھا۔ مگر دوسرے دن جو میری بات میں پھنسے بیٹھے تھے وہ سمجھ گئے اور انہوں نے خالی نظروں سے کمرے کی تلاشی لی اور اٹھ کھڑے ہوئے میں نے اٹھ کر سب کو صبح تک کے لئے سلام دعا کی اور پھر کمرے کی طرف آیا تو لالہ دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ میں نے تجھے کیمرہ لکھا تھا' لے آیا؟ مجھے لالے کی بات عجیب لگی۔ میں نے فوراً کہا" لالہ بتایا تو ہے کہ آگ لگ گئی تھی اور ہم پھنس گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے تو جان بچی اور ہم ......" اس نے میری بات ٹوک دی۔ "اچھا صبح بات کریں گے"...... مگر صبح پتہ چلا کہ لالہ آدھی رات ہی کو واپس چلا گیا۔ لالے کے بعد جب میں چاچے عمر شاہ کو اس کی عینک نہ دے سکا اور ماسے کریم دین کو دو گھوڑا بوسکی کا رومال نہ ملا تو وہ سب ایک ایک کر کے چلتے گئے۔ جبکہ انہوں نے مجھے آتے ہی دعوت کا کہہ دیا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بھی نہ لوٹا۔

باہر مینہ رم جھم رم جھم برس رہا تھا اور میرے اندر مجھے اس طرح لگ رہا تھا جیسے میں آگ والے راستے پر چلا جا رہا ہوں۔ لوگ ہجوم میں پھنس گئے ہیں اور افراتفری مچنے سے انہوں نے رونا اور چلانا شروع کر دیا ہے۔ میں نے سوچا دکھ کی جو پھانس میرے اندر آ گئی ہے جا کے دوستوں کے پاس جا کر نکال آؤں۔ میرے دوست ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ شام کو میں نے ایک دوست کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازے میں سے نکلتے ہوئے کھلے بازوؤں سے میرا استقبال کیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں اب تک پتھروں پر سر مارتا رہا ہوں۔ اس نے میری بات کا جواب پیار سے دیا اور پوچھا "کب آئے؟" تو میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس نے میرے آنسو اپنے رومال میں لے لئے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ بادل اچھی طرح برس کر چھٹ گئے ہیں اور میرے سینے پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہے۔ میں سوچنے لگا چلو دنیا میں کوئی تو ایسا نکلا جسے میرے سکھ کی دیوار گرنے کا پتہ ہے۔ اس نے اچانک میرے خیالوں کی بستی سے آواز دی۔ "تو بچ کر تو آ گیا ہے نا۔ یہی شکر والی بات ہے"۔ تو میں پھر اپنے وہی سادہ خیال سجا کر بیٹھ گیا کہ کسی ایک آدھ کو شاید

میری بخیریت واپسی کی خوشی ہے۔ میں اپنے دھیان میں ڈوبا خوش فہمیوں کے کنویں سے میٹھے پانی کو تلاش کر رہا تھا کہ اس نے پھر کنویں میں جھانک کر مجھ سے پوچھا۔ اچھا وہ تو اچھا ہوا کہ تم آ گئے مگر تمہیں گھڑی لکھی تھی۔ میرے کنویں کا سارا پانی اتر گیا اور میں اچانک نیچے سے اوپر کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بات میرے ہونٹوں پر رکی رہی اور پھر جو میں بولا تو مجھے اپنی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔ شاید میں نے اسے یہی کہا۔ کوئی نہیں آگ بہت زوروں پر تھی نا...... اس نے اپنی آواز کو مدھم کرتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"اوہو! اوہو...... اچھا کوئی بات نہیں۔" مگر مجھے یوں لگا جیسے اس کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔ اس کے دل میں وہ نہ تھا۔ اس نے مجھے چائے پانی تو ضرور پلایا مگر میرے جواب کے بعد اس کے مزاج میں انوکھی تبدیلی آ گئی تھی۔ پھر اس نے خود ہی اپنی بے صبری چھپاتے ہوئے کہا "اچھا یار مجھے ایک کام ہے برا نہ مانو تو مجھے اجازت دو حیرانی اس بات کی ہے کہ گھر میں اسکے بیٹھا میں تھا اور اجازت وہ مجھ سے مانگ رہا تھا۔ میں اٹھ کر آ گیا۔

گلی کے آخری کونے پر میں پہنچا تو جیسے میں اپنے آپ میں آ گیا۔ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ میں اس کی بیٹھک سے اس نکڑ تک چل کر کیسے آ گیا۔ میرے اندر آگ والا منظر پھر جلنے بجھنے لگا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ یہ وہی شہر ہے۔ اور میں وہی انسان ہوں۔ فرق صرف ایک سال کا ہے۔ صرف ایک سال میں لوگ اتنے بدل گئے ہیں۔ بچے اتنے جوان ہو گئے ہیں۔ یہ وہی دوست ہیں جو میرے ساتھ پڑھتے تھے اور جو میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہے ہیں۔ ہم چندہ کر کے فلم دیکھا کرتے تھے۔ فٹ پاتھ کے کباب والوں سے لے کر بڑے ہوٹلوں تک اکٹھے جایا کرتے تھے۔ یہ وہی چچا ہے جو مجھے کبھی کتابوں کے پیسے دیا کرتا تھا۔ یہ وہی ماموں ہے...... مگر میری سوچ کے پر بکھر گئے اور میں اوپر ہی اوپر اڑتا گیا۔

یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہ آتی تھی کہ لوگ اتنی جلدی میں کیوں ہیں؟ میں جسے ملنے جاتا ہوں۔ اسے آگے کہیں کام کیوں جانا ہوتا ہے۔ میں جسے کہتا ہوں یار...... میں نے تجھے خط لکھا

تھا۔وہ کہتا ہے...... ہاں یاد آتا ہے۔اب تو بہت پرانی بات ہے۔اور بات یہ ہے کہ خط لکھنے والی بات بالکل پرانی نہیں۔ میں نے دسمبر میں سب کو لکھا تھا کہ میں آگ میں پھنس گیا تھا۔افراتفری میں لوگ صحیح رستے سے بھٹک کر غلط راہ پر چل پڑے تھے اور آگ کے محاصرے میں آ کر بہت سے لوگ جل گئے تھے۔لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں بھاگ کر بچ گیا ہوں۔تو جواب میں سب نے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے کیمرے، بوسکی، عینک اور ریڈیو کی فرمائش لکھی تھی۔اور اب میں جس کو اپنی بات سناتا ہوں وہ ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ شہر جیسے جنگل ہو اور انسان خانہ بدوش بن کر دن گزار رہے ہیں کہ آج یہاں کل وہاں۔ کسی کو فرصت نہیں اور کوئی میری کہانی سننے کو تیار نہیں ہوتا۔

جو دن بھی میں نے شہر میں گزارا وہ دن قطرہ قطرہ بارش بن کر میرے اندر اتر گیا اور باہر کے سارے راستے آگ کے اونچے اونچے شعلوں کی زد میں آ گئے۔ میں ماں کی تسبیح اور ابا بے سائیں کا مصلا لے آیا تھا اور وہ دونوں اپنے لئے ان چیزوں کو بڑی نعمت سمجھتے ہوئے مجھ پر بہت خوش تھے۔ میں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا لیکن مجھے لگتا تھا کہ یہ بارش کا موسم میرے لئے اچھا نہیں۔اور پھر ایک رات میں سویا ہوا تھا کہ تڑ تڑ ژالہ باری ہونے لگی۔موسلا دھار بارش ہونے لگی اور مجھے لگا جیسے میں زندہ آدمی اس بارش میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ویسے بھی میں آگ میں سے زندہ گزر کر آیا ہوں۔اگر میں دریا میں جا ڈوبوں تو شاید میری اہمیت بڑھ جائے مگر اس وقت تک میں بے نام رہوں گا جب تک دریا کنارے کھڑا روتا رہوں گا۔آج اگر میں بازار میں کھڑا ہو کر اپنی دکھ بھری کہانی سنانا شروع کروں تو مجھے کوئی نہ پوچھے گا۔لیکن اگر پولیس گولی مار کے میری لاش اپنی گاڑی میں لے جائے تو سارا شہر میرا وارث بن جائے گا۔اور اگر میں پھر جی پڑوں تو میرے وارث پھر سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔

تڑ تڑ...... اولے اندر بھی برسنے لگے اور میں اپنا اٹیچی کیس بستر اور تھیلا اٹھا کر گھر سے نکل کھڑا ہوا اور آگ والے رستے پر چل پڑا۔

حفیظ خان

حاصل جمع

بات تو کچھ ایسی نہ تھی لیکن چائے کی پیالی میں طوفان آ گیا۔ وہ شیلا سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔باقاعدہ اس لئے کہ اس سے تعارف اور اظہار خیال کے بعد میں نے اسے کئی بار چائے کی دعوت دی۔مگر وہ ہر مرتبہ بڑی بدصورتی سے ٹال گئی۔ یہ اور بات کہ میں ذہنی طور پر بدصورتی کو ناپسند کرتا ہوں۔لیکن میں نے پھر بھی ہار نہ مانی اور آخر شیلا نے چائے کے لئے ریوالونگ ریسٹوران آنے کا وقت دے ہی دیا۔

اسے میری بدقسمتی کہئے کہ چائے آنے پر شیلا نے اصرار کیا کہ چائے وہ بنائے گی۔ مجھے کیا انکار ہو سکتا تھا۔اس کی انگلیوں کی حرارت بھی چائے میں حل ہو جاتی مگر بات یہیں بگڑ گئی کہ جس وقت اس نے کپ میں پہلے شکر ڈالی۔پھر دودھ اور پھر اس میں قہوہ ملانا شروع کر دیا میں لاکھ عاشق پر تلا ہوا سہی پر ذوق بھی کسی شے کا نام ہے۔میری آواز خود بخود اونچی ہو گئی اور برداشت کا نام بھی ذہن میں نہ رہا۔

"مجھے اس طرح چائے بنانا بالکل پسند نہیں"

"مگر کس طرح؟"

"اس طرح کہ قہوے میں دودھ ملانے کی بجائے دودھ میں قہوہ ملایا جائے۔"

"پر نیٹ رزلٹ تو ایک ہی ہوتا ہے کہ چائے بن جاتی ہے۔"

"یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ فتح کیسے ہے؟"

"تو پھر ہو کیا گیا؟"

"مجھے کراہت آتی ہے۔گھٹن سی ہوتی ہے، ڈر لگتا ہے"

''یا اللہ...... پر کیوں؟''

اس لئے کہ دودھ اجالے کی علامت ہے اور قہوہ اندھیرے کی۔ اگر اجالے میں اندھیرا ملایا جائے تو شام ہوتی ہے اور پھر رات بن جاتی ہے موت کی علامت اور مجھے رات سے ڈر لگتا ہے۔ اور اگر قہوے میں دودھ ملایا جائے تو اندھیرے میں اجالا گھلتا ہے اور جس وقت اندھیرے میں اجالا گھلے تو صبح ہوتی ہے۔ صبح جو زندگی ہے۔''

''مجھے تو شام اچھی لگتی ہے۔ سانولی سانولی۔ دل چاہتا ہے آشیانوں کی طرف لوٹتے ہوئے پرندوں کی قطار میں رل مل جاؤں''۔

''شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اپنے اصل کی طرف جانا موت کہلاتا ہے''۔

''کتنا مکروہ اور گھٹیا ہے تمہارا فلسفہ...... میرا شام کا امیج برباد نہ کرو''۔

''شاید تم نے صبح دیکھی نہیں''۔

ایک مرتبہ دیکھی تھی۔ جس وقت گرمیوں میں اسے ہی بند ہو گیا تھا۔ بالکل ہی واہیات تھی۔ آنکھیں پوری طرح کھولنے کے لئے بھی پورے جسم کی طاقت خرچ کرنی پڑی تھی۔

جبکہ شام کو ایسے نہیں ہوتا۔

(اف میرے اللہ اتنا اختلاف) ''سوری...... میں نہ جانتا تھا کہ تم...... میں نے غلطی کی ہے''۔ ''میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری غلطی پر اور تمہارے گلے سڑے فلسفے پر۔'' شیلا ناراض ہو کر اٹھی تو میز الٹ گئی۔ چائے قالین پر گر گئی اور ایک آدھ برتن بھی ٹوٹ گیا۔ چائے نہ پینے کا تو کوئی افسوس نہ تھا۔ مگر ہال میں بیٹھے لوگوں کی نظروں کے وار اپنے جسم پر برداشت کرنا بہت مشکل تھا میں پیدل ہی چل پڑا۔ سامنے نیشنل لائبریری کا بورڈ نظر آیا۔

ہونہہ...... کتنی واہیات جگہ ہے۔ جہاں ہر قسم کے گدھے گھوڑے گھاس کھانے آجاتے ہیں۔ اور وہ شیلا بھی تو پہلی بار مجھے یہیں ملی تھی۔ بدذوق کوڑھ مغز۔ آخر میں نے اس سے تعارف ہی کیوں کیا۔ ہاں یاد آیا کہ وجہ اس کے سرخ ٹماٹر جیسے چہرے پر نیلی نیلی آنکھوں کا ہونا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی بلکہ یہ تھی کہ میرا رنگ بھی ٹماٹر جیسا ہے اور آنکھیں بھی نیلی ہیں۔ کالج کے زمانے میں ایک لڑکی پر دل آ گیا۔ مگر اس نے یہ کہہ کے لاجواب کر دیا کہ نیلی آنکھوں والے مکار اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔ گھر آ کر کافی دیر تک آئینہ دیکھتا رہا۔ مگر اس لڑکی کی بات کا جواب کہیں لکھا ہوا نہ ملا۔

پھر یونیورسٹی میں ایک اور حسینہ سے بات چلانے کی کوشش کی تو قصور آنکھوں کا نکل آیا۔ تنگ آ کر میں نے ڈارک گلاسز پہننے شروع کر دیئے۔ لیکن پھر کہیں کوئی موقع نہ مل سکا۔ آخر ایک دن نیشنل لائبریری میں شیلا کو دیکھ لیا۔ میں ٹھٹکا اس لڑکی سے کسی طرح سلام دعا کر لی جائے تو یہ مجھے طعنہ نہیں دے گی کہ میں مکار اور دھوکے باز ہوں اور پھر ہمت کر کے میں نے کہہ ہی دیا ''سنئے جی!''

اس نے میری آنکھوں کو دیکھا۔ ٹھٹکی اور پھر مسکرا اٹھی۔ ''فرمائیے''

''میں ایم بی اے میں پڑھتا ہوں۔ بس ایک پیپر رہ گیا ہے۔ میں تو فلسفے میں ایم اے کرنا چاہتا تھا مگر ابو نے کہا......''

میرے بھی ابو نے کہا تھا کہ فلسفہ احمق پڑھتے ہیں۔ لیکن مجھے بہت پسند ہے۔

کون؟ احمق!

نہیں۔ فلسفہ

پھر تو خوشی ہوئی کہ آپ جیسی لڑکی فلسفہ پڑھتی ہے۔

اوں ہونہہ...... میں تو کیمسٹری پڑھتی ہوں۔

''اور وہ فلسفہ''

''میں نے کہا نا ابو......''

''اچھا اچھا...... ابو......''

پھر ہم کافی دیر تک باہر لان میں بیٹھ کر مختلف فلسفیوں کا تعارف ایک دوسرے سے کراتے رہے لیکن جس وقت میں گھر واپس آیا تو یاد آیا کہ نہ تو میں نے اپنا نام اسے بتایا اور نہ اس کا پوچھا۔

اسے پتے کا تو ذکر ہی کیا۔ بڑا افسوس ہوا کہ زندگی میں ایک ہی تو اپنے جیسی ملی اور اسے بھی...... اس طرح نام و نشان پوچھے بغیر ہی کھو بیٹھا۔

اس بے وقوفی کا کفارہ پورے دو مہینے تک نیشنل لائبریری جا کر ادا کرتا رہا پھر جا کر کہیں اس سے آمنا سامنا ہوا۔

''اچھا...... تو یہ آپ ہیں...... مگر میں تو آپ کا نام بھول گئی ہوں۔ شاید...... شاید نہیں...... یقیناً...... وہ اس لئے کہ میں نے اپنا نام آپ کو بتایا ہی نہیں تھا اور نہ آپ سے پوچھا تھا''۔

''اچھا سوری''

تب جا کر ہمیں ایک دوسرے کے نام معلوم ہوئے۔ مگر نام معلوم ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب تک کہ پتہ معلوم نہ ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اتفاقاً چار ملاقاتیں ہو جائیں تو پھر گھر کا پتہ بتانا چاہئے اور ساتویں اتفاقیہ ملاقات پر چائے کی دعوت قبول کر لینی چاہئے۔

اس طرح سات اتفاقیہ ملاقاتوں کے بعد پہلی باقاعدہ ملاقات ہوئی بھی تو کیا کہ سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔ میں نے خود کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ کیوں بلایا تھا اسے چائے پر۔ آئس کریم ہی کھلا دیتا۔ یا وہ ماں چھولے...... وہ نہیں تو ملک شیک یا کوئی جوس ووس ہی ہو جاتا۔

نہ چائے پر بلاتا اور نہ اس طرح اصولوں کی جنگ ہوتی اور نہ یہ شام دیکھنی پڑتی۔ زندگی میں پہلی بار ٹماٹر جیسی رنگت اور نیلی آنکھیں ملیں۔ مگر اپنی بے وقوفی سے انہیں گنوا بیٹھا۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر تسلی ہوئی کہ کیا ہوا۔ اگر لڑکی چلی گئی لیکن فتح تو اصولوں کی ہوئی ہے۔

اس واقعے کو دو سال گزر گئے۔ نہ وہ کہیں مجھے ملی اور نہ میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ایک دن اچانک کتابوں کی ایک دکان پر شیلا سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ مجھے اس کا اسطرح منہ پھیر لینا اچھا لگا۔ اس کے اس اوپرے سلوک میں بھی اپنوں جیسی خوشبو اور حرارت تھی۔ میرا غصہ ہوا ہو گیا۔

''تم ابھی تک اکیلی ہو''؟

''اور تم بھی تو......''

''ہاں...... میں بھی...... مگر تمہارے گورے رنگ پر نیلی آنکھیں...... مجھے بہت اچھی لگتی ہیں......''

اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی۔

''تمہاری آنکھوں کا رنگ بھی تو نیلا ہے''

''مگر تم نے صبح تو دیکھی نہیں''۔

''مجھے شام اچھی لگتی ہے۔ وسعت ہی وسعت...... کنواری کے آنچل کی طرح۔

''مگر تم...... دودھ میں قہوہ ملانا نہیں چھوڑ سکتیں؟''

تمہیں چائے سے غرض ہے نا؟

''پھر بھی قہوے میں دودھ ملانا چاہئے''

''میں تمہاری غلام نہیں...... میں جا رہی ہوں۔''

''مگر......''

''صبح میری فلائٹ ہے امریکہ کے لئے...... پی ایچ ڈی کرنے جا رہی ہوں......''

شیلا کے جانے کے بعد میں نے چائے پینی چھوڑ دی اور ایک کارخانے میں ملازمت کر لی۔ کارخانے کا مالک تھوڑے دنوں میں ہی مجھ پر مہربان ہو گیا۔ پروموشن پر پروموشن اور ساتھ...... کار بنگلہ اور ٹھاٹھ باٹھ...... جو خواب دیکھتا تھا سب پورے ہو گئے سوائے شادی کے۔ پتہ نہیں کیوں اب شادی کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ لگتا تھا اگر شادی کر لی تو اصولوں کی جنگ ہار جاؤں گا۔ پتہ نہیں کیسی بیوی آئے۔ اور کہاں کہاں اختلاف برداشت کرنے پڑیں۔ لیکن پھر بھی وہ ہو گیا جو نہ ہونا چاہئے تھا۔

مالک نے ایک طرف ساری جائیداد بینک بیلنس اور ساتھ اپنی کالی کلوٹی ایک اکلوتی بیٹی رکھدی اور دوسری طرف نوکری سے نکال دینے کا نوٹس۔

میں نے نوٹس اٹھالیا۔

مالک نے آخری داؤ کھیلا۔ نوٹس کل وصول کرلینا۔ آج شام میرے گھر چائے پر آنا......

''میں بالکل چائے نہیں پی سکتا اور وہ بھی شام کو''۔

تو پھر صبح ناشتے میں آجانا۔

مگر میں چائے نہیں پیتا۔

''لسی پی لینا''۔

یوں لگا جیسے وہ مجھے ڈھگا ہونے کا طعنہ دے رہا ہو۔ دوسرے دن صبح مالک کے ساتھ اس کی ایک اکلوتی لاڈلی کالی دیگ کے سامنے ناشتہ کررہا تھا۔

''آپ شکر کتنی لیں گے''؟

اتنی کالی اور بدصورت اور آواز اتنی میٹھی اور رسیلی

میں نے کچھ نہ کہا

اس نے ایک چمچہ شکر کپ میں ڈالی۔ پھر قہوہ ڈالا اور پھر دودھ ملانا شروع کردیا۔

اس کا نام بھی شائستہ تھا۔

شائستہ سے شادی کے دو سال بعد ہمارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں کی طرح کالا اور میری طرح نیلی آنکھیں۔ انوکھا ملاپ تھا۔

کچھ عرصے بعد مالک جواب مالک نہیں رہا تھا۔ بیمار ہوگیا۔ علاج بائی پاس آپریشن تجویز ہوا۔ شائستہ اور میں بھی امریکہ چلے گئے۔

آپریشن کے بعد مالک تو واپس آگیا اور ہم سیر سپاٹے کے لئے وہیں رہ گئے۔

اس روز امریکہ اور کینیڈا کی سرحد پر دنیا کی سب سے خوبصورت آبشار ''نیاگرا'' دیکھنے کا

موقع ملا۔ میں دیکھنے میں گم ہوگیا۔ پانی کا پانی کے ساتھ ملاپ......کیسی موسیقی اور کیسے رنگ بکھیر رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھا تو جا سکتا تھا لیکن محسوس کرکے بیان نہ ہوسکتا تھا۔ شائستہ اور ٹمی پھولوں پر بیٹھی تتلیاں پکڑنے کے لئے دوڑ رہے تھے۔

ہائے اللہ......دیکھو تو سہی۔

''میں چونک اٹھا......

بالکل ہمارے ٹمی کی طرح ہے۔ ذرا بھی تو فرق نہیں۔

وہ بالکل ہی ٹمی جتنا تھا اور ویسا ہی کالا رنگ جس پر چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں۔ اسی وقت پھولوں کی اونچی کیاری کے پیچھے شیلا ظاہر ہوئی۔ اس نے حیرانی سے ٹمی کو اور پھر اپنے بچے کو دیکھا۔ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ مجھے اور شائستہ کو دیکھا تو مسکرا پڑی۔

''تو جناب یہاں ہیں؟''

میرے منہ سے صرف ''جی'' ہی نکل سکا۔

آؤنا......تمہیں اپنے ہسبنڈ سے ملواؤں......نو مسلم ہیں۔ حسین نام ہے۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ نیگرو تھا۔ میں نے ٹمی اور شیلا کے بچے کو دیکھا۔ شائستہ کے ساتھ شادی کے بعد یہ میرے اصولوں کی دوسری ہار تھی۔ شیلا نے میری سوچ کو شاید پڑھ لیا تھا۔ اسی لئے تو مسکرانے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

''میں نہ کہتی تھی کہ نیٹ رزلٹ تو چائے ہی ہوتی ہے''

قاسم سیال

گوٹی اور اسٹرائیکر

جب سے درویش نے مجھ پر عنایت کی تھی...... میرا عجیب حال تھا...... دل کہتا تھا کہ ساری دنیا کی مخلوق سے باتیں کروں جب پہلے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تو میں نے سوچا کہ آج نہیں بچتے۔ آج مارے گئے۔ درویش جو میرے ساتھ بیٹھا تھا بڑے سکون اور اطمینان سے بولا۔ ''کیا بات ہے عزیزم''؟ میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ اے بزرگ! جو خواہش ساری دنیا سے باتیں کرنے کی یعنی بہت بولنے کی میرے دل میں پیدا ہوئی ہے مجھے شک ہے کہیں میری بیوی کی روح میرے اندر نہ آ گئی ہو۔

درویش بولا...... ''نہ بابا...... یہ اس کلام کا اثر ہے جو میں نے پڑھ کر تجھ پر پھونکا ہے'' میں نے سوچا کاش اگر ایسا ہوتا تو میں اسے بے روح کر دیتا۔ بد حال دل خوش ہوا کہ اب خوب گزرے گی۔ وہ ایک بولنے والی ہوگی۔ اور میں نے جب کلام پڑھ کر پھونکا اور گھر کے ستون' کھڑکیاں' دروازے میرے ساتھ بات کریں گے تو حیرانی سے اس کی گھگھی بندھ جائے گی۔ ممکن ہے اس کی قوت گویائی ہی ختم ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اسے اس کلام غیبی کی برکت سمجھوں گا جس کو پڑھ کر میں اس دنیا کی ہر چیز چرند پرند سب سے بات کر سکتا ہوں۔

ہم اس وقت بیٹھے ہوئے کرم بورڈ کھیل رہے تھے۔ میری بیوی نے بورک ڈال کر ساری گوٹیوں کو بورڈ کے درمیان کر دیا۔ اور سٹرائیکر کے ساتھ ان کو نشانہ مارا۔ سٹرائیکر لگنے سے گوٹیاں ادھر ادھر بکھر گئیں اور ایک گوٹی بورڈ کے چاروں کونوں میں بنے ہوئے سوراخوں میں سے ایک میں چلی گئی۔ جونہی سٹرائیکر کے ساتھ گوٹیاں بکھریں ایک شور سا میرے کانوں میں آیا۔ ''خدا تیرا بیڑا غرق کرے''۔ لیکن میں آرام سے بیٹھا رہا۔ وہ کہنے لگی۔ یہاں جنات کا سایہ ہے...... یہ مکان ہے بھی ایسا...... میں تو ایک پل بھی یہاں نہ بیٹھوں گی...... گوٹی کی آواز آئی...... ''اے انسان!

عورت واقعی ناقص العقل ہوتی ہے...... نہیں سوچتی کہ جس کو میں نے دکھ پہنچایا ہے...... اس کے بھی جذبات ہوں گے...... اس کی بھی آہ نکلے گی۔ مائی جی! یہ ہماری بد دعا ہے...... ہمارا احتجاج ہے...... تمہارے ظلم کے خلاف...... یہ جنوں وتوں کا سایہ نہیں'' یہ سن کر میری بیگم بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تو میں نے کہا'' بیگم صاحبہ...... ذرا آج زندگی میں پہلی بار چپ ہوں...... تو مجھے ان سے بات کرنے دیں...... میں نے کہا...... ''اے بورڈ کی گوٹیو! تمہیں کھیلنے کے لئے ہی بنایا گیا ہے...... تو پھر تمہارے اس احتجاج کا مطلب''؟

ان میں سے ایک نمائندہ گوٹی نے جواب دیا...... اس بات کا فیصلہ تمہاری صوابدید پر ہے کہ ہمارے ساتھ کھیلو یا ہمیں آپس میں مل جل کر رہنے دو...... اس نے کہا...... ہماری بھی کیرم بورڈ کی ایک محدود دنیا ہے...... جتنا اور جیسا بھی ہے...... ہمارا وطن ہمیں عزیز ہے اور ہمیں جان سے بھی پیارا ہے اور جب ہم اپنی سرخ جوڑا پہنے ہوئے ملکہ کے چاروں طرف بیٹھتی ہیں تو پھر ہم میں گورے کالے کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ ہم آپس میں بلا امتیاز رنگ ونسل اتفاق اور اتحاد کے ساتھ رہتی ہیں۔ ہماری سوچ یہ ہوتی ہے کہ ہم کسی کا برا نہیں چاہتیں اور توقع کرتی ہیں کہ ہمیں بھی کوئی نہیں چھیڑے گا۔ مگر جس وقت یہ سٹرائیکر جو ہمارا ہی بھائی بند بنتا ہے اور ہماری برادری کا ہوتا ہے۔ تمہارے ہاتھوں میں آتا ہے تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ اپنوں پر ظلم کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ہمیں منتشر کر دے۔ بورڈ کے چاروں طرف جو گہری کھائیاں بنی ہیں ان میں دھکا دے دے تا کہ ہم اپنی محدود دنیا میں آزادی کے ساتھ نہ رہ سکیں۔ وہ اس دنیا کا اکیلا مہاراجا بن کر رہے۔ لیکن اس بے عقل کو کئی بار تجربہ کرنے کے باوجود عقل نہیں آئی کہ ہم زخمی یا مردہ یا الگ الگ ہو کر اپنی طاقت ختم کر بیٹھتے ہیں اور آخر کار بورڈ پر ہماری نسل کی ایک بھی گوٹی نہیں رہتی۔ پھر تمہاری انگلیاں اس ستم ظریف لاڈلے کو بھی ہمارے ساتھ اس اندھی کھائی میں پھینک دیتی ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ یہ دوسروں کے ہاتھ کھلونا کیوں بنا رہتا ہے؟

پھر اس نے پوچھا'' قاسم میاں تمہارا اصل نام کیا ہے''؟

''میرا نام قاسم ہے'' میں نے جواب دیا۔

مگر تمہیں میرے نام کا پتہ کیسے لگا؟...... ''میں نے تمہیں تمہاری صفت سے پکارا ہے۔ تم ہمیں اسٹرائیکر کے ساتھ جمع سے تقسیم کرتے ہو۔ اس نسبت سے تمہیں قاسم کہا ہے۔ بہر حال تم اسم بامسمّیٰ ہو۔ ہاں...... تو میں کہہ رہی تھی۔ جونہی تم اسٹرائیکر کے ذریعے ہمارا نشانہ لیتے ہو ہم کالی ہوں یا گوری سب ایک دوسرے کو گلے لگائے ہوتی ہیں۔ مگر تم ہمیں الگ الگ کرکے مارتے ہو۔ اگر ایک کالی گوٹی کو مارتا ہے تو دوسرا کسی گوری کو۔ تمہارے اس کھیل میں تو تماشہ ہم دونوں بنتے ہیں۔ نقصان تو دونوں کا ہوتا ہے۔ گوٹی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا...... تم ہمارے راستے میں یہ سلحے کیوں بکھیر دیتے ہو جو ہمیں جلدی سے موت کے منہ میں لے جاتا ہے''

میں نے کہا...... ''ہم تو صرف بورک استعمال کرتے ہیں'' ''میں اس کا ذکر کررہی ہوں جس پر پھسل کر ہم اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردیتے ہیں۔ آخر ہماری تمہاری دشمنی کیا ہے؟ کیا ہمارا جرم یہی ہے کہ ہم چھوٹی ہیں۔ تم بڑے ہو...... تمہارے پاس بورک ایمڈ ہے۔ ہم اتفاق کو اچھا سمجھتی ہیں۔ تم انتشار پسند کرتے ہو۔ کیا تم اپنی طاقت کو ان کھائیوں میں پھینکنے کی بجائے ان اندھے کنووں کو بند کرنے میں خرچ نہیں کرسکتے؟ تاکہ ہم ان میں گرنے سے بچ سکیں۔''

''ہم ایک ایک کرکے مرتی رہتی ہیں۔ اور تمہارے نمبر بڑھتے رہتے ہیں۔ کیا تمہیں کبھی ان نمبروں سے بھی چھٹکارا ملے گا؟ جب ہمارے بورڈ پر تم دونوں کھیلتے ہو...... تمہاری انگلیاں اشارے کرتی ہیں۔ تم میں سے ایک کالی گوٹی کو نشانہ بناتا ہے تو دوسرا گوری کو۔ دوسری بار دونوں اپنے اپنے نشانے تبدیل کرلیتے ہو۔ دونوں کھلاڑیوں میں سے جو ایک رنگ کی زیادہ گوٹیاں اس اندھی کھائی میں گرا دیتا ہے اس کے نمبر بڑھ جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک جیتتا ہے۔ دوسری دفعہ دوسرا۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ تمہارا آپس میں مقابلہ ہے۔ اصل میں تمہاری آپس میں کوئی لڑائی بھڑائی نہیں ہوتی۔ تمہاری انگلیاں حرکت کرتی ہیں تو ہماری نسل کا طاقت ور باغی اسٹرائیکر ہم پر نشانے باندھتا ہے۔ ہم زخمی ہوتی ہیں۔ یا تنگ آکر اپنی سرزمین چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر تمہیں اس

سے ملتا کیا ہے؟''

میں نے اس کی فضول بور کرنے والی باتیں سنیں تو معاملہ ختم کرتے ہوئے اسے کہا۔

''اگر کوئی پیغام دینا ہو تو بتاؤ'' ...... گوٹی نے کہا...... ''پیغام تو اس صورت میں دوں اگر کوئی ہماری سنتا بھی ہو...... تمہیں کچھ کہنا فضول ہے...... تمہارا ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن چونکہ اس میں نادانستہ طور پر بلا سمجھے اپنے انجام سے بے خبر ہمارا اپنا بھائی بندا استعمال ہو رہا ہے تو پیغام یہی ہے کہ اسٹرائیکر کو کہنا...... تم نے ہم نے پھر اکٹھے رہنا ہے۔ پہلے تجربے سے سبق حاصل کرکے اب پھر ان ہاتھوں میں کھلونا نہ بننا۔''

پروین عزیز

آنسوؤں کا رنگ

فاطمہ کوئی زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ سانولا رنگ لیکن نقوش بہت خوبصورت تھے۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں نے اس کی شخصیت کو دلکش بنا دیا تھا۔ اگر اس کے چہرے پر سبز آنکھیں اور ان میں سرخ ڈورے نہ ہوتے تو وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔

بستی میں گندم کی کٹائی کا موسم آیا۔ تو شہر میں اسکولوں کو دو مہینے کی چھٹیاں ہو گئیں۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی نمبردار کی بیٹیاں نیرو اور ریتا بستی کی سیر کرنے آئی تھیں۔ ایک دن وہ فاطمہ کے گھر آئیں۔ تو فاطمہ اس وقت نہا دھو کر سبز رنگ کا سوٹ پہنے بیٹھی تھی۔ اور سبز رنگ کا بڑا سا دوپٹہ لپیٹے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ سے اس کے کپڑوں کا رنگ اتنا مل رہا تھا کہ نیرو اور ریتا تو اسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ فاطمہ پہلی ملاقات میں نیرو اور رینو کی سہیلی بن گئی۔ روز روز کے ایک جیسے معمول سے تنگ آ کر نیرو نے اپنے گھر میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ دعوت والے دن فاطمہ نے سرخ رنگ کا بالکل سادہ جوڑا اور سرخ رنگ کا دوپٹہ پہنا۔ نیرو اور ریتا کو بڑی حیرت ہوئی کہ فاطمہ کو یہ رنگ بھی بہت سج رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایسے چمک رہی تھیں جیسے ان میں کسی نے آگ لگا دی ہو۔

"فاطمہ...... تم تو بس وہی رنگ پہنا کرو جو تمہاری آنکھوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نیرو کے اس مشورے پر فاطمہ شرما کر لال سرخ ہو گئی۔

چھٹیاں ختم ہوئیں تو ریتا اور نیرو شہر چلی گئیں۔ کچھ عرصے بعد نمبردار نے اپنے بیٹے سلیم کے لئے فاطمہ کا رشتہ مانگا۔ فاطمہ کا باپ بہت خوش ہوا کہ اس کی بیٹی کسی خوشحال گھر میں زندگی گزارے گی۔ آخر کار شادی کا دن آ گیا۔ رینو اور نیرو نے بھائی کی نہایت اعلیٰ بری بنائی

تھی۔ فاطمہ کے کپڑوں میں سرخ اور سبز کپڑوں کی بھرمار تھی۔ شادی کی رات سرخ کناری والا سوٹ پہن کر فاطمہ دہک رہی تھی۔ ولیمے والے دن نیرو نے اسے سبز رنگ کا غرارہ سوٹ پہنایا۔ تو اس کی آنکھوں کا رنگ اور گہرا ہو گیا اور سرخ ڈورے ہلکے گلابی ہو گئے۔ فاطمہ کا حسن دنیا دیکھتی نہ تھکتی تھی۔ مگر اس کے باوجود فاطمہ کے دل میں ایک حسرت تھی خلش تھی ایک کانٹا سا چبھا تھا۔ کہ کاش کبھی سلیم بھی اس کی آنکھوں کی تعریف کرے۔ یا کبھی وہ بھی اسے یہ احساس دلائے کہ یہ رنگ اسے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن سلیم کی لاپروائی اپنی جگہ پر برقرار رہی۔

ایک دن سلیم فاطمہ کو اپنے ایک ڈاکٹر دوست کی دعوت پر اس کے گھر لے گیا۔ فاطمہ نے اس روز خوب سنگھار کیا کہ شاید آج سلیم کا دل موم ہو جائے۔ اس نے سبز رنگ کی ساڑھی پر سرخ رنگ کا بلاؤز پہنا تو وہ سر سے پاؤں تک سج گئی۔ دعوت کے بعد ڈاکٹر کی بیوی نے فاطمہ سے کہا "آپ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے سبز شام پر سرخ پھل لگا ہو" "کیوں سلیم ٹھیک ہے ناں؟ اس نے سلیم کو مخاطب کیا۔

"جی...... جی...... جی...... بھابی!" سلیم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ تو اس کا ڈاکٹر دوست بے اختیار ہنس پڑا۔ اور بیوی کو کہنے لگا۔ انہیں کیا پتہ بیگم۔ یہ صاحب تو کلر بلائنڈ ہیں۔

"اچھا...... اوہو...... تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں سرخ اور سبز رنگ میں فرق محسوس نہیں ہو سکتا" "جی ہاں...... بالکل نہیں...... محترم کو یہ خصوصیت خیر سے وراثت میں ملی ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر اور اس کی بیوی ہنسنے لگے اور فاطمہ کو یوں لگا جیسے زندگی کے سارے رنگ جل کر راکھ ہو گئے ہیں اور ایک رنگ باقی رہ گیا ہے۔ حسرتوں کا رنگ آنسوؤں کا رنگ جو اس وقت اس کی آنکھوں میں امڈ آیا تھا۔